معارف

دسمبر ۲۰۱۹ء

مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۲۸۰/روپئے۔ فی شمارہ ۲۵/روپئے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۴۸۴/روپئے

دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۶۶۰/روپئے۔ دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۷۸۰/روپئے

ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۳۰۰/روپئے میں دستیاب۔

پاکستان میں ماہنامہ معارف کے لئے رابطہ کریں

HAFIZ SAJJAD ELAHI

196 - AHMAD BLOCK, NEW GARDEN TOWN

LAHORE (PUNJAB) PAKISTAN

Tel: 0300 - 4682752, (R) 5863609, (O) 7280916

Email: abdulhadi_133@yahoo.com

سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں۔

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط وکتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

Email: shibli_academy@rediffmail.com, info@shibliacademy.org

Website: www.shibliacademy.org

Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh

Account No: 4761005500000051 - IFSC No: PUNB0476100

(Office Mobile) 09170060782

ڈاکٹر فخرالاسلام اعظمی (جوائنٹ سکریٹری رمنیجر) نے معارف پریس میں چھپوا کر

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی ودینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۰۴ ماہ ربیع الثانی ۱۴۴۱ھ مطابق ماہ دسمبر ۲۰۱۹ء عدد ۶

فہرست مضامین

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

شذرات

سید یحییٰ قرطبی اندلسی نے جنت گم گشتہ اندلس کے سقوط پر ایک بڑا درد انگیز مرثیہ لکھا تھا۔ اس کا اردو ترجمہ سرسید نے ''مرثیہ مصائب اندلس'' کے عنوان سے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع کیا تھا۔ دارالمصنّفین سے شائع ہونے والے ''شذرات سرسید'' میں یہ مرثیہ شامل ہے۔ اس میں ایک جگہ وہ کہتا ہے:

''اس مصیبت نے پچھلی مصیبتوں کو بھلا دیا۔

اور یہ مصیبت بہت سا زمانہ گزرنے پر بھی نہ بھولے گی''۔

بابری مسجد کے بارے میں عدالت عالیہ کے فیصلہ کو سننے کے بعد یہ اشعار بے ساختہ ذہن کے پردے پر ابھر آئے۔ ہندوستانی مسلمان بہت سے مصائب اور مشکلات سے دوچار ہوئے ہیں لیکن یہ حادثہ ان کے لیے بہت جاں گداز ہے۔ اس کے لیے انہوں نے بڑی قربانیاں دی ہیں۔ مزید برآں یہ مقدمہ صرف بابری مسجد کے تحفظ کا نہیں تھا بلکہ اس کا تعلق دراصل دستور ہند کی روح کے تحفظ سے جڑا ہوا تھا۔ چنانچہ اس فیصلہ کے مضمرات اس سے کہیں زیادہ اہمیت کے حامل ہیں جتنے وہ بادی النظر میں محسوس ہوتے ہیں۔ اگرچہ حقیقت یہ ہے کہ بابری مسجد تو مسلمانوں کے ہاتھ سے ۱۹۴۹ء ہی میں نکل چکی تھی جب ایک منصوبہ بند سازش کے تحت رات کی تاریکی میں مسجد میں مورتیاں رکھ دی گئی تھیں لیکن مسجد کا وجود باقی تھا، اس کی خوبصورت اور پرشکوہ عمارت اپنی جگہ پر موجود تھی، اس کے گنبد اور منبر و محراب ابھی سلامت تھے، اس لیے امید بھی باقی تھی۔ ۱۹۹۲ء میں اس کا وجود بھی ختم کر دیا گیا اور اسے لوح ایام سے مٹا دیا گیا۔ ہر اخلاقی اور قانونی ضابطہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے نہایت بے دردی سے اسے منہدم کر دیا گیا۔ لیکن ہندوستان کا سیکولر اور جمہوری دستور باقی تھا اور عدلیہ موجود تھی اس لیے انصاف کی امید ختم نہیں ہوئی تھی اور حق و انصاف کی فتح کا امکان باقی تھا۔ دستور اب بھی موجود ہے جو اس ملک میں رہنے والے تمام لوگوں کو یکساں حقوق کی ضمانت فراہم کرتا ہے لیکن انصاف کی امید نے دم توڑ دیا۔ عدالت عالیہ اپنی جگہ پر قائم ہے لیکن دادرسی کی توقع باقی نہیں رہی۔ اکثریتی نفسیات کے آگے انصاف سرنگوں ہو گیا۔ ملک کی سب سے بڑی اقلیت جس کو دوسری اکثریت کہا جائے تو نامناسب نہیں ہوگا، انصاف کے حصول میں ناکام رہی، اس ناانصافی پر ہمارے دل خون ہیں لیکن اس ملک کے مسلمانوں نے اپنے وعدہ کا پاس کیا اور اس فیصلہ کو قبول کیا۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ اس معاملہ میں عدالت عالیہ سے جو بھی فیصلہ آئے گا وہ اسے قبول کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے اس فیصلہ کو ایسے صبر و تحمل سے قبول کیا جس کی کوئی مثال نہیں۔ یہ فیصلہ جن حالات اور جس پس منظر میں ہوا اس کے پیش نظر کسی اور فیصلہ کی امید بھی نہیں کی جا سکتی تھی لیکن جب کسی امید کی کوئی گنجائش بھی نہ ہو اس وقت بھی امید کا دامن تھامے رہنا انسانی فطرت ہے۔ "Hoping against hope" کا محاورہ انسانی فطرت کے

اسی پہلو کی عکاسی کرتا ہے۔ چنانچہ دیوار پر لکھی ہوئی تحریر کو دیکھنے کے بعد بھی ایک موہوم سی امید باقی رہی، خاص طور سے اس لیے بھی کہ اسی مقدمہ کی سماعت کے دوران عدالت عالیہ نے دوٹوک انداز میں اس بات کا اظہار کیا تھا کہ مقدمات کا فیصلہ قانون اور شواہد کی بنیاد پر ہوتا ہے نہ کہ عقائد کی بنیاد پر۔ مسلمانوں کا مقدمہ حق و انصاف پر مبنی تھا، دلائل وشواہد ان کے حق میں تھے، قاعدہ اور قانون ان کی حمایت میں تھے۔ دوسری طرف کوئی دلیل، کوئی شہادت، کوئی قانونی اساس نہیں تھی۔ اس کے باوجود قانون پر آستھا کی فتح ہوئی۔ کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں۔

ہندوستانی مسلمانوں نے ماضی میں بہت سی غلطیاں کی ہیں، بحیثیت حکمراں بھی، بحیثیت محکوم بھی اور آزاد ہندوستان کے شہری کی حیثیت سے بھی۔ ان میں سے بعض غلطیاں اپنے نتائج اور مضمرات کے لحاظ سے ہمالیائی تناسب کی حامل رہی ہیں۔ ان غیر معمولی کوتاہیوں میں سے ایک کی دردناک داستان کا مختصر تذکرہ گذشتہ مہینہ میں شذرات میں آچکا ہے۔ کہتے ہیں کہ لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی۔ یہاں تو صدیوں کی خطا کا مسئلہ ہے، لیکن یہ بھی امر واقعہ ہے کہ بابری مسجد کی بازیابی کے لیے دستوری حدود کے اندر جو کچھ بھی ممکن تھا اس میں انھوں نے کوتاہی نہیں کی بالخصوص عدالت عالیہ میں اس مقدمہ کی پیروی جس طرح کی گئی اس سے زیادہ کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس طویل اور صبر آزما کشمکش کے دوران انھوں نے پوری پامردی اور ثابت قدمی کا ثبوت دیا۔ مقدمہ کی پیروی کے لیے اعلیٰ درجہ کے وکلاء کی خدمات حاصل کی گئیں۔ وکلاء نے بھی جس ذمہ داری اور تیاری کے ساتھ مقدمہ کی پیروی کی، جس جانفشانی سے ثبوت اور شواہد فراہم کیے اور جس قابلیت اور لیاقت سے عدالت عالیہ کے سامنے اپنا موقف پیش کیا، اس سے زیادہ کی امید نہیں کی جاسکتی۔ اس میں بھی سپریم کورٹ کے سینئر وکیل ڈاکٹر راجیودھون کا معاملہ ایک استثناء کی حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے اس مقدمہ کا حق جس طرح ادا کیا اس کی حیثیت ایک مثال کی سی ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ گو فیصلہ مسلمانوں کے حق میں نہیں آیا لیکن تقریباً تمام بنیادی معاملات میں ان کے موقف کو تسلیم کیا گیا۔ مثال کے طور پر عدالت نے یہ تسلیم کیا کہ مندر کو توڑ کر مسجد نہیں بنائی گئی اور آثار قدیمہ کی کھدائی میں جو باقیات ملی ہیں ان سے حتمی طور پر یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہاں پہلے کوئی مندر تھا۔ نیز یہ کہ ۱۹۴۹ء میں مسجد میں مورتیوں کا رکھنا ایک مجرمانہ فعل تھا۔ اسی طرح ۱۹۹۲ء میں شرپسندوں کے ذریعہ مسجد کا انہدام ایک مجرمانہ کارروائی تھی۔ ڈاکٹر راجیودھون اس مقدمہ سے بالکل ابتدا سے وابستہ رہے ہیں اور اس کی پیروی انھوں نے بلا معاوضہ کی ہے۔ ان کی ان کاوشوں اور خدمات کے لیے ہندوستانی مسلمان ان کے ممنون رہیں گے۔

اس فیصلہ کے تضادات کے بارے میں بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور اس سلسلہ میں پائی جانے والی صورت حال پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آچکی ہے۔ متعدد ماہرین قانون جن میں سپریم کورٹ کے سابق

جج بھی شامل ہیں، اس کے ہر پہلو پر پوری شرح و بسط سے اظہار خیال کر چکے ہیں۔ بے شمار انصاف پسند برادرانِ وطن نے اس فیصلہ پر اپنے غم و غصہ اور دکھ کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ یہاں اس پہلو سے اس پر کسی مزید گفتگو کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر کسی کو اس سلسلہ میں مستند معلومات اور نہایت اعلیٰ درجہ کے قانونی تجزیہ سے دلچسپی ہو تو انہیں اس موضوع پر مشہور ماہر قانون جناب اے۔ جی۔ نورانی کے مضمون کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ یہ مضمون فرنٹ لائن میں چھپا ہے اور بڑے پیمانے پر شیئر کیا گیا ہے۔ اس میں نہ صرف فیصلہ کے مختلف پہلوؤں، اس کے تضادات اور کمیوں کا نہایت باریک بینی سے جائزہ لیا گیا ہے بلکہ اس کی مختصر تاریخ بھی بیان کر دی گئی ہے۔ یہ فیصلہ ہندوستانی عدلیہ کی تاریخ میں اس حیثیت سے یادگار رہے گا کہ اس میں تمام تر شواہد صرف مسلمانوں کے پاس تھے اور وہ اتنے واضح اور فیصلہ کن نوعیت کے حامل تھے کہ عدالت عالیہ نے ان کو تسلیم کیا اور ان کو اپنے فیصلہ میں جگہ دی لیکن فیصلہ اس فریق کے حق میں ہوا جس کے پاس نہ تو کوئی دلیل تھی اور نہ شہادت، فیصلہ ان لوگوں کے حق میں دیا گیا جو خود عدالت عالیہ کے مطابق غیر قانونی اور مجرمانہ طور پر مسجد کو شہید کرنے کے ملزم تھے۔

دستور میں عدالت عالیہ کے فیصلوں پر نظر ثانی کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں بھی ریویو پٹیشن کی گنجائش موجود ہے۔ البتہ یہ بات بھی معلوم ہے کہ عدالت عالیہ شاذ و نادر ہی اپنے کسی فیصلہ پر نظر ثانی کرتی ہے اور بالعموم وہ اپنے پہلے فیصلہ پر قائم رہتی ہے۔ چنانچہ جو لوگ قانون میں دستیاب اس سہولت کا فائدہ اٹھانے کے حق میں ہیں وہ بھی یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ اس کا کوئی فائدہ ہونے والا نہیں ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ ریویو پٹیشن کو داخل کرنے کا فیصلہ اس لیے کیا گیا کہ ۹۹ فیصد مسلمان اس کے حق میں تھے۔ بہرحال یہ فیصلہ ملی قیادت کو کرنا تھا اور اس نے اس سلسلہ میں فیصلہ کر بھی لیا ہے اور ان سطور کے لکھنے سے پہلے کم از کم ایک ریویو پٹیشن جمعیت علماء ہند کی طرف سے سپریم کورٹ میں داخل بھی کی جا چکی ہے۔ ہم امید کرتے ہیں اس سلسلہ میں تمام متعلقہ مسائل پر پوری طرح غور و خوض کر لیا گیا ہوگا اور یہ فیصلہ عجلت یا جذبات کے دباؤ میں نہیں کیا گیا ہوگا۔ اس تعلق سے دو باتیں بالکل واضح ہیں۔ پہلی یہ کہ جن قائدین نے یہ فیصلہ کیا ہے وہ بھی اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ اس معاملہ میں کسی بھی قسم کی کوئی ریلیف ملنے کا امکان نہیں ہے۔ یہ فیصلہ جس پس منظر اور جن حالات میں ہوا ہے اس کے پیش نظر اب اس میں کسی تبدیلی کا امکان نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ ایک متفقہ فیصلہ نہیں ہے اور اس کی نسبت سے مسلمانوں کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ موافقین اور مخالفین کا تناسب کیا ہے، اس سلسلہ میں کچھ کہنا ممکن نہیں ہے۔ البتہ یہ خواہش شاید بیجا نہیں کہ اس نہایت حساس مسئلہ میں کوئی متفقہ موقف اختیار کیا گیا ہوتا تو زیادہ مناسب ہوتا۔ یہ بات بھی افسوس ناک ہے کہ ایک ساتھ ریویو پٹیشن داخل کرنے کا فیصلہ بھی عدمِ اتفاق کا شکار ہو گیا۔

مقالات

علامہ شیخ جار اللہ لاہوری، مہاجر مدنی

رفیق حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ

☆ مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے ایک ممتاز شاگرد اور خود صاحب کمالات، شیخ علامہ جار اللہ لاہوری تھے، ان کے والد صاحب کا نام عبد الرحیم تھا، یہ پنجابی النسل اور لاہور کے رہنے والے تھے، بڑے قاری، بڑے عالم، بڑے ماہر قرآن اور علوم اسلامیہ میں حضرت شاہ ولی اللہ سے مسلسل اور طویل استفادہ کرنے والے تھے، شیخ جار اللہ کے دینی، علمی پس منظر یا خاندان وغیرہ کی نسبت کچھ معلوم نہیں، لیکن ان کے لئے حضرت شاہ ولی اللہ اور علمائے حجاز کی لکھی ہوئی اجازتیں اور سندیں واضح کرتی ہیں کہ وہ علم و فضل اور معرفت میں بلند درجہ رکھتے تھے، انہوں نے ابتدائی تعلیم کہاں اور کن اساتذہ سے حاصل کی، اس کا بھی کچھ سراغ نہیں ملتا لیکن جتنا معلوم ہے وہ کم ہونے کے باوجود غیر معمولی ہے اور ہندوستانی مسلمانوں اور طبقہ علما کے اعزاز و مسرت و فخر کے لئے کافی ہے۔

مولانا کے حالات میں یہ بات بہت اہم ہے کہ وہ چھ سال تک مسلسل حضرت شاہ صاحب کے ساتھ رہے، سفر و حضر میں علوم ولی اللہی سے استفادہ کی یہ مدت اس لحاظ سے نہایت اہم ہے کہ اس وصف میں غالباً شاہ محمد عاشق پھلتی اور حضرت شاہ عبد العزیز بھی ان کے ہم پایہ نہیں تھے۔

شاہ صاحب نے خود لکھا ہے کہ:

صحبني أخونا في الله عزوجل الصالح، المجود لكتاب الله، الآخذ حظاً صالحاً من سنة رسول الله صلى الله عليه وسلم: الشيخ جار الله بن عبد الرحيم من أهل پنجاب، قريبا من ست سنين۔

☆ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی، کاندھلہ، ضلع شاملی (یو۔پی)۔

قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ صاحب سے وابستگی اور عقیدت کی یہ مبارک مدت غالباً ۶۰-۱۱۵۹ھ کی ہے، شاہ صاحب کی خدمت میں چھ سال گذارنے کے بعد وہ سفر حرمین کے لئے روانہ ہو گئے، اس سفر کے درمیان حضرت شاہ صاحب نے ان کو تین خط لکھے، یہ مکتوبات مجموعۂ مکتوبات(۱) حضرت شاہ ولی اللہ میں بھی شامل ہیں۔ اس وقت زبان حال بلکہ قال سے کہتے ہوں گے:

"کہ من فتراک صاحب دولتے بستم سرِ خود را"

شیخ نے حضرت شاہ سے، حضرت حفص عن عاصم کی روایت سے، نہایت غور و فکر سے قرآن کریم پڑھا اور اس کے ضمن میں غرائب القرآن، ان کے معانی، شان نزول وغیرہ کے لئے حضرت شاہ صاحب سے گہرا اور مسلسل استفادہ کیا۔ شاہ صاحب نے لکھا ہے: "فاستمر علی ذلك حتی ختم القرآن"۔

اس کے بعد تفسیر بیضاوی کا ابتدا سے کچھ حصہ اور سورۂ بنی اسرائیل سے سورۂ احزاب تک پڑھا۔ تفسیر جلالین، سورۂ یونس سے سورۂ کہف تک سنی اور صحیح بخاری آغاز کتاب سے کتاب التفسیر تک پڑھی اور اس کے کچھ حصوں کی سماعت کی۔ اسی طرح صحیح مسلم اول سے کتاب البیوع تک اور کچھ حصہ آخر کا پڑھا اور سنن ابوداؤد اول سے کتاب الجہاد تک جامع ترمذی اول سے آخر تک، سنن نسائی ابتدا سے اختتام تک، اسی طرح سنن ابن ماجہ آغاز سے انجام تک! سنن دارمی کے دو تہائی حصے سنے اور تیسرا آخری حصہ پڑھا اور مسند امام احمد کے بھی کچھ حصے پڑھے، مسند عبداللہ بن عمر وغیرہ اور کچھ حصے مشکوٰۃ کے اور کچھ مصابیح کے پڑھے اور امام ترمذی کی شمائل النبی صلی اللہ علیہ وسلم پڑھی اور حصن حصین، دلائل الخیرات اور قصیدہ بردہ اور قصیدہ بانت سعاد اور حزب البحر اور حرز یمانی یہ سب بھی بتمام و کمال پڑھیں۔

حضرت شاہ صاحب کی مختلف موضوعات پر جو تصانیف تھیں، ان کی بھی قرأت و سماعت کی اور ان کی اجازت لی، جس میں مسوی من احادیث المؤطا اول سے آخر تک پڑھی اور اس کے ذریعہ سے آثار مؤطا اور احادیث میں اپنی اسانید کو امام مالک تک پہنچایا اور اسی کے ساتھ اس کتاب کے اکثر مباحث فقہیہ اخذ کئے اور کتاب (حجۃ اللہ البالغہ) علم اسرار الشریعہ میں اور الإنصاف فی بیان اسباب الاختلاف نیز عقد الجید فی احکام الاجتہاد و التقلید اور القول الجمیل (جو تینوں طرق اور نقشبندیہ، جیلانیہ میں ہے) اور مسلسلات من أحادیث النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور النخبة فی سلسلة الصحبة اور الفوز الکبیر فی اصول علم التفسیر اور

اس کے علاوہ حضرت شاہ صاحب کی تصانیف ورسائل، شاہ صاحب سے پڑھے اور اخذ کئے، نیز اور علوم وفنون جیسے فقہ حنفی میں ہدایہ، علم کلام میں شرح مواقف کے بعض حصے، نخبۃ الفکر اور اس کے مصنف کی لکھی ہوئی شرح، علم اصول حدیث میں اور کتاب عوارف المعارف تصوف میں، اول سے آخر تک اور کچھ حصہ احیاء علوم الدین کے آغاز سے اور اس کے علاوہ اور بہت سی کتابیں ہیں جن کے ناموں کا، ان اوراق میں آنا مشکل ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے مولانا جاراللہ کی سند میں لکھ دیا ہے:

"مما یتعذر عدہ فی ھذہ الورقۃ"

شاہ صاحب نے شیخ جاراللہ کو روایت ضیافۃ الاسودین التمر والماء سے بھی نوازا اور مشابکہ بھی کیا، علامہ شیخ ابراہیم کردی مدنی کی کتاب "الأمم لإیقاظ الھمم" بھی پڑھائی اور اس کی اجازت دی۔

علوم ظاہریہ میں اعلیٰ درجہ کے کمالات کے علاوہ، اشغال سلوک وتصوف میں بھی بلند پرواز رسائی حاصل کی اور حضرت شاہ صاحب سے مختلف سلسلوں کی اجازتیں لیں، شاہ صاحب نے ان کو خرقۂ فقر پہنایا اور ان کو اپنے تمام عملیات اور جو کچھ شاہ صاحب کو یاد تھا، وہ سب عنایت فرما دیا۔ سند کے آخر میں یہ ربانی الفاظ تھے کہ: "واللہ علیٰ ما نقول وکیل"۔

حضرت شاہ صاحب کو اپنے دور کے علما سے جو اجازتیں ملی تھیں، جیسے شیخ عیسیٰ مغربی کی کتاب مقالید الاسانید اور ان کی دوسری تالیف ضبط اسناد البابلی، شیخ ابراہیم کردی کی "کتاب الامم" حسن عجمی کی "کتاب الاسناد" شیخ محمد بن محمد بن سلیمان رودانی کی "صلۃ الخلف بموصول السلف" شیخ احمد النخلی کا "رسالہ" ان سب کی اجازتیں شیخ صاحب کو عطا فرمائیں اور لکھا کہ:

"وأشھد فی حقہ للہ وفی اللہ ولأجل دین اللہ، أنہ رجل صالح، معرض عن الدنیا، مواظب للأعمال الصالحۃ، حقیق أن یوخذ منہ علم النبی صلی اللہ علیہ وسلم الظاھر منہ والباطن"۔

حضرت شاہ کا یہ اجازت وخلافت نامہ، آغاز ۲/محرم ۱۱۷۳ھ بروز جمعہ (۱۷۵۹-۶۰ء) کا لکھا ہوا ہے، جو اس بات کی واضح شہادت ہے کہ یہ اجازت نامہ شیخ جاراللہ کے سفر حرمین کے بعد کا ہے، یعنی سلسلۂ اخذ واستفادہ سفر حرمین کے بعد بھی جاری رہا۔

شیخ کے نام حضرت شاہ ولی اللہ کے تین معلوم گرامی ناموں کی تفصیل اس طرح ہے:

پہلا خط، جو مولانا جاراللہ کی حج کے لئے روانگی کے وقت لکھا گیا تھا، جس میں مسقط، عمان میں ایک ایسے کامل اور فرد فرید کی طرف رہنمائی کی گئی تھی کہ وہاں ایک عمر دراز بزرگ ہیں، اللہ تعالیٰ کی نظر رحمت خاص طور سے ان کی جانب ہے، شاہ صاحب نے اس خط میں شیخ جاراللہ کو ہدایت فرمائی تھی کہ وہاں جائیں، انہیں تلاش کریں اور ان سے ملیں۔ ان سے میرا اسلام کہیں اور کہہ دیں کہ یہ فقیر آپ سے خاص روحانی محبت رکھتا ہے، اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا اور آپ سے ملاقات کی صورت بنی، تو انشاء اللہ عمل میں آئے گی، فی الوقت دعا بظہر الغیب سے متمتع فرمائیں اور لکھا ہے کہ اگر تمہارا (شیخ جاراللہ) کا وہاں سے گذر اور ملاقات نہ ہو، تو اپنے کسی آدمی کو ان تک پہنچانے کی کوشش کریں کہ اس میں ایک نکتہ ہے۔ واللہ أعلم بدقائق الأمور

حضرت شاہ صاحب نے ان بزرگ کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے یہ بہت بلند شعر بھی لکھا ہے:

فلو قدرتُ علی الإتیان لزرتکم سیراً علی الوجه أو مشیاً علی الرأس

دوسرے خط میں مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کے لئے معمول اور نظام اوقات طے فرمایا ہے کہ مدینہ طیبہ اور مکہ مکرمہ میں وقت کس طرح گذارنا چاہیے، وہاں شبانہ روز کے کیا معمولات اور ترتیب ہونی چاہیے۔

تیسرا خط، مولانا جاراللہ کے خط کے جواب میں ہے، جس میں شیخ جاراللہ نے مسقط، عمان جانے کی اور وہاں ان شیخ کے تلاش کرنے اور اس میں ناکام رہنے کی اطلاع دی تھی، اس کا جواب حضرت شاہ صاحب نے عربی میں تحریر فرمایا ہے، جس بزرگ شخصیت کا میں نے تذکرہ کیا تھا، وہ کوئی معروف عالم نہیں ہیں، وہ دراز قد، سیاہ رنگ ہیں اور تاجروں کے حلیہ میں رہتے ہیں، علم کی نسبت سے ان کی شہرت نہیں ہے اور تم جوان تک نہیں پہنچے، اس میں بھی قدرت کا ایک راز ہے، جو ملاقات کے وقت واضح کروں گا۔ (۲)

مولانا جاراللہ کی اس صاحب کمال شخصیت سے ملاقات ہوجاتی، تو دنیا کے لئے ان کے متعلق واقفیت کا راستہ کھلتا، لیکن افسوس کہ یہ مہ کامل ناواقفیت کی تہوں میں روپوش ہو گیا اور دنیا ان کے تعارف سے محروم رہ گئی۔

شیخ جاراللہ کی تعلیم کے بعد کیا کیا مصروفیات تھیں، کہاں قیام رہا، اس کی تفصیلات نہیں ملتیں،

صرف یہ معلوم ہے کہ شیخ جاراللہ جلد ہی مدینہ منورہ ہجرت کر گئے تھے، مدینہ طیبہ کے قیام میں، وہاں کے بڑے علماء اور اساطین علم سے پڑھا، قرأت و تجوید اور حدیث شریف کی سندیں حاصل کیں، اسی مبارک و پاکیزہ سرزمین میں زندگی کے بقیہ ایام گذارے اور اسی ارض مقدس میں پیوند خاک ہوکر، اپنی مراد کو پہنچ گئے۔

''خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را''

تاریخ مدینہ اور علمائے مدینہ کے احوال پر جو کتابیں ہیں، ان میں مولانا جاراللہ کا تذکرہ نہیں ملا، حالانکہ نامور مؤرخ مدینہ، شیخ عبدالرحمن انصاری نے، جو اسی دور کے ہیں، لکھا ہے:

کہ مدینہ طیبہ میں لاہوری بہت ہیں

''بيت اللاهوري، وإليه ينتسب كثير بالمدينة المنورة''(۳)

علامہ شیخ جاراللہ نے مدینہ پاک کے متعدد کبار محدثین اور قراء سے اعلیٰ کتابیں پڑھیں، تجوید اور قرآن کریم کی تصحیح و تکمیل فرمائی، ان میں سے چند اساتذہ اور محدثین کی سندیں، مولانا جاراللہ نے اپنے قلم سے الفضل المبین کے ساتھ محفوظ کر دی ہیں، ان سندوں میں ایک سند محدث الحرمین الشریفین، شیخ محمد بن طیب الفاسی المغربی کی ہے، مولانا نے شیخ طیب سے کتب ستہ کے اوائل پڑھے، ان کی اجازت چاہی، شیخ نے ان کو اجازت سے نوازا اور لکھا:

''فأجازه في جميع ما يجوز له روايته ويصح عنه تحمله من الحديث والتفسير والأصلين وفي جميع تاليفه وغير ذلك بشرطه المعتبر عند أهل الأثر مع كمال التثبيت في ضبط الرواية والإعتناء في الدراية''

اور اس اجازت و درس میں، شیخ محمد مسعود ابن ابراہیم، شیخ اسماعیل نقشبندی اور سید محمد خلیفہ ابن سید احمد شیخ القراء بھی، مولانا جاراللہ کے ساتھ اور ہم سبق تھے۔

ایک اور سند شیخ محمد بن محمد مالکی مغربی کی ہے جو علامہ شیخ عبداللہ بن سالم بصری کے شاگرد تھے اور شیخ حیات سندھی کو بھی، شیخ عبداللہ بن سالم سے اجازت تھی، یہ سند ۱۰ر شوال ۱۱۶۹ھ (۱۷۴۶ء) کی مکتوبہ ہے۔

ایک اور اجازت شیخ اسماعیل بن عبداللہ رومی نقشبندی سے ہے، جو قرآن کریم کی اور کتب قرأت کی ہے، یہ شیخ القراء عبداللہ مصری کے شاگرد تھے۔

ہمارے سامنے شیخ جاراللہ کے لکھے ہوئے جو اوراق ہیں، اس میں بس یہی تذکرہ ہے، لیکن

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کے اور بھی اوراق ہوں گے، جن میں اور علماء محدثین کی اجازات، تحریر ہوں گی۔ آخر میں مولانا جاراللہ کے لئے، حضرت شاہ ولی اللہ کی تحریر فرمائی ہوئی مکمل سند پیش کی جاتی ہے، جس سے اندازہ ہوگا کہ مولانا جاراللہ، کس مقام و مرتبہ کے اور کس شان کے بزرگ تھے۔ یہ سند اگر چہ ایک مرتبہ شائع ہو چکی ہے،(۵) مگر پیش نظر تحریر، خود شیخ جاراللہ کے قلم سے ہے، اس لئے اس کی اپنی اہمیت ہے۔

اس وقت تک حضرت شاہ ولی اللہ کی جو اجازتیں اور سندیں معلوم ہیں، ان میں کوئی اور اجازت وسند اس جامعیت اور شان کی نہیں ہے جس میں حضرت شاہ صاحب نے اپنے اندرون کا سب دیدینے اور انڈیلنے کی صراحت فرمائی ہو۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله الذی بنعمته تتم الصالحات وعلى فضله المحول فی جمیع الحالات وعلى سیدنا سید البریات، أفضل الصلوات والتسلیمات، وعلى آله وصحبه ومن تبعهم بإحسان من المؤمنین والمؤمنات۔

أما بعد! فیقول الفقیر إلى رحمة الله الکریم، أحمد المدعو بولی الله بن عبدالرحیم ألحقه الله بسلفه الصالحین، صحبنی أخونا فی الله عزوجل، الصالح المجود لکتاب الله، الآخذ حظا صالحاً من سنة رسول الله صلی الله علیه وسلم، الشیخ جار الله بن عبدالرحیم من أهل بنجاب قریباً من ست سنین، فقرأ علی فی تلك المدة القرآن العظیم بروایة حفص، عن عاصم وبحث عليّ فی ضمن ذلك ما أشکل علیه من غریب القرآن ومعانیه وشان نزوله، فذکرت له من حفظی ما یحتاج إلیه من غیر مراجعة إلى تفسیر، فاستمر على ذلك حتى ختم القرآن۔

وسمع علی طرفا من تفسیر البیضاوی من أوله، وقرأ علی طرفا من سورة بنی إسرائیل إلى سورة الأحزاب، وسمع علی تفسیر الجلالین من سورة یونس إلى سورة الکهف، وقرأ علی صحیح البخاری من أوله إلى کتاب التفسیر، وسمع علی أطرافا منه وسمع علی صحیح مسلم من أوله إلى کتاب البیوع وأطرافاً من آخره، وقرأ علی سنن

أبي داؤد من أوله إلى كتاب الجهاد۔

وقرأ على جامع الترمذى من أوله إلىٰ آخره، وقرأ على سنن النسائى من أوله إلى آخره، وقرأ على سنن ابن ماجة من أوله إلىٰ آخره، وسمع على الثلثين من مسند الدارمى الأولين، وقرأ على ثلثه الآخر، وقرأ على طرفا من مسند الإمام أحمد من مسند عبدالله بن عمرو وغيره، وسمع على طرفا من المشكوٰة، وطرفا من المصابيح، وقرأ على شمائل النبى صلى الله عليه وسلم للترمذى والحصن الحصين، ودلائل الخيرات، وقصيدة البردة، وقصيدة بانت سعاد وحزب البحر، والحرز اليمانى، فى كل ذلك بالتمام والكمال۔

وقرأ على شيئاً من كتبى ورسائل التى الفتها فى أصناف العلوم، فمن ذلك، كتاب المسوىٰ من أحاديث المؤطا من أوله إلى آخره، واتصل له بذلك الإسناد إلى مالك رحمه الله فى آثار الموطأ وأحاديثه واطلع ذلك على معظم المباحث الفقهية، ومن ذلك كتاب الحجة (الله) البالغة فى علم أسرار الشريعة، ومن ذلك الإنصاف فى بيان سبب الاختلاف، وعقد الجيد فى أحكام الإجتهاد والتقليد والقول الجميل فى أشغال الطرق الثلاث، النقشبندية والجيلانية والمسلسلات من حديث النبى صلى الله عليه وسلم والنخبة فى سلسلة الصحبة، والفوز الكبير فى أصول علم التفسير، وغير ذلك من كتبى ورسائلى، وقرأ وسمع من سائر الفنون ما تيسر له كأطراف من الهداية فى الفقه الحنفى، وبعض شرح المواقف فى علم الكلام، والنخبة وشرحها للمصنف فى علم أصول الحديث، وقرأ على كتاب عوارف المعارف فى التصوف من أوله إلى آخره، وطرفا من أول إحياء علوم الدين، وغير ذلك مما يتعذر عده فى هذه الورقة۔

وبالجملة أجزته لتدريس ما قرأ على وسمع على، وجميع ما تصح لى روايته، وألبسته الخرقة الفقرية وأضفته على الأسودين وشابكته وأجزته أيضا لتلقين الأشغال الصوفية من حفظه منى وإلباس الخرقة الفقرية، وأجزته للأعمال التصريفية مما حفظه منى۔

وأشهد فی حقه لله وفی الله ولأجل دین الله أنه رجل صالح، معرض عن الدنیا، مواظب للأعمال الصالحة، حقیق أن یؤخذ منه علم النبی صلی الله علیه وسلم، الظاهر منه والباطن، والله علی ما نقول وکیل۔

وأجزته أن سبعةً من علماء المتأخرین لکل منهم ثبت فی الإسناد، الشیخ عیسی المغربی، له کتاب مقالید الأسانید و کتاب آخر ضبط فی إسناد البابلی، والشیخ إبراهیم الکردی، له کتاب الأمم و کتاب الإسناد للحسن العجیمی وصلة الخلف لمحمد بن محمد بن سلیمان الرودانی، ورسالة للشیخ أحمد النخلی، ورسالة للشیخ عبد الله البصری۔

وقد صح لی الإجازة لکل ما فی هذه الرسائل عن أصحابها والحمد لله رب العالمین۔

کتبت هذه السطور یوم الجمعة الحادی والعشرین من محرم الحرام ......

مفتتح ۱۱۷۳ھ من هجرة نبینا صلی الله علیه وسلم۔ وأنا الفقیر المعترف بالتقصیر

ولی الله بن عبد الرحیم

کان الله تعالیٰ فی الأولیٰ والآخرة والحمد لله أولاً وآخراً وظاهراً وباطناً۔

اس کے بعد ان سندوں اور اجازات کے کچھ حصے بھی نقل کئے جاتے ہیں، جو علمائے حرمین شریفین نے مولانا جار اللہ کو عطا فرمائی تھیں، جس سے مولانا کے علمی، روحانی مرتبہ اور علو استعداد کا علم ہوتا ہے۔

مولانا جار اللہ نے الفضل المبین کے آخر میں ملحق اوراق میں، اپنی سندیں نقل کی ہیں، جن میں سے حضرت شاہ ولی اللہ کی مفصل سند اوپر گذر گئی ہے، اس کے علاوہ:

۱۔ شیخ عمر بن بنت الشیخ (نواسہ علامہ عبد اللہ بن سالم بصری) وفات: ۱۱۷۴ھ (۶۱-۱۷۶۰ء)

۲۔ شیخ احمد بن عبد الرحمن الاشبولی، شافعی، نزیل مکہ (وفات: ۱۱۷۳ھ/ ۶۰-۱۷۵۹ء)

۳۔ شیخ محمد بن محمد صالح مرداد (وفات: ۱۲۰۵ھ/ ۹۱-۱۷۹۰ء، مکہ)

۴۔ شیخ محمد بن محمد مغربی مالکی (وفات: ۱۲۰۱ھ/ ۸۷-۱۷۸۶ء، مدینہ منورہ)

۵۔ شیخ اسماعیل بن عبد اللہ رومی، حنفی، نقشبندی (وفات: ۱۱۶۰ھ/ ۱۷۴۷ء، مدینہ منورہ)

ان میں سے بعض سندیں مفصل ہیں، بعض مختصر لیکن ان کا مکمل متن نقل کرنے کا یہاں موقع

نہیں۔ ہر ایک میں سے وہ چند سطریں، جن سے مولانا جاراللہ کے تلمذ و اجازت اور ان کے مقام و مرتبہ کا علم ہوتا ہے، نقل کی جاتی ہیں۔ ہر ایک سند کی عبارت سے پہلے، صاحب سند کا مختصر تعارف بھی تحریر ہے۔ شخصیات اور اجازت ناموں کی نقل، مولانا شیخ جاراللہ لاہوری کی تحریر و ترتیب کے مطابق ہے۔

(۱)

اجازت و سند شیخ عمر بن احمد سقاف (عمر ابن بنت الشیخ)

شیخ عمر ابن بنت الشیخ: ابو حفص (احمد) عمر ابن عقیل الحسینی المکی الشافعی، جو علامہ عبداللہ بن سالم بصری کے نواسہ تھے اور اسی نسبت کی وجہ سے عمر بن بنت الشیخ لکھے جاتے ہیں۔(۶) ۱۱۰۲ھ (۹۱-۱۶۹۰ء) میں مکہ مکرمہ میں ولادت ہوئی، ۱۱۷۴ھ (۶۱-۱۷۶۰ء) میں وفات ہوئی۔(۷)

الحمد لله والصلوٰة والسلام على رسول الله۔

وبعد فقد قرأ العالم الفاضل والفاهم الكامل، الشيخ جار الله ابن الشيخ عبد الرحيم الهندى اللاهورى، أوائل الكتب الستة التى هى دواوين الإسلام وغيرها، وقد أجزته بما فيها وبجميع ما يصح عنى روايته من حديث وتفسير وفقه وغيرها، بشرطه المعتبر عند أهل الأثر، كما أجازنى بذلك جملة من الشيوخ ذوى الأقدام الكاتبة والرسوخ، من أجلهم شيخ المحدثين ببلد الله الأمين "بل" وسائر بلاد المسلمين۔

شيخى وأستاذى، وجدى لأمى، مولانا الشيخ عبد الله بن سالم البصرى المكى رحمه الله۔ ونفعنا به سائلا منه أن لا ينسانى فى الدعاء فى خلواته وجلواته، ببلوغ المرام لا سيما حسن الختام۔

كتبه فقير ربه وأسير ذنبه

عمر بن احمد بن عقيل السقاف باعلوى

[عمر ابن بنت الشيخ] عفا الله

(۲)

شیخ احمد بن عبدالرحمن اشبولی مصری، نزیل مکہ

شیخ اشبولی مصر کے رہنے والے تھے، ہجرت کر کے مکہ مکرمہ آ گئے تھے، شیخ اشبولی، علامہ مرتضیٰ

بلگرامی زبیدی کے استاذ ہیں، علامہ مرتضیٰ نے اپنے ثبت "المعجم المختص" میں شیخ کا "الامام الفقیہ، المحدث الزاہد" سے تعارف کرایا ہے اور ان کے اساتذۂ کرام کا تذکرہ کیا ہے۔ علامہ مرتضی زبیدی نے ان کی صحبت میں ایک وقت گذارا، ان کے علوم وکمالات سے کثیر استفادہ کیا اور حرم مکہ میں شیخ اشبولی کے دروس میں حاضر رہے۔ شیخ عبداللہ مرداد ابوالخیر نے شیخ محمد اشبولی (۸) کے کئی بڑے شاگردوں کے نام لکھے ہیں، شیخ اشبولی کی علامہ زبیدی کی صراحت کے مطابق ۱۱۷۳ھ (۶۰-۱۷۵۹ء) میں وفات ہوئی، مگر شیخ عبداللہ مرداد ابوالخیر نے سن وفات ۱۱۷۱ھ (۵۸-۱۷۵۷ء) ذکر کیا ہے۔

أما بعد! فقد أسمعني مولانا الفاضل، والعالم العامل، الشيخ جار الله بن الشيخ عبد الرحيم الهندي اللاهوري! أوائل كتب الحديث الشريف والتمس مني الإجازة في ذلك وفي جميع ما يجوز لي روايته من حديث وتفسير وغيرهما لصلته أني من أهل تلك المسالك، فأحببته لطلبه رجا[ء] الانتظام في سلك دعوته، راجيا من الله تعالىٰ أن يمن عليّ وعليه بدوام التقوىٰ والتوفيق، والحشر في زمرة أفضل صديق

رقمه الفقير إلى مولاه المولى، أحمد بن عبد الرحمان الأشبولي

(۳)

شیخ محمد بن محمد صالح میر داد

مکہ مکرمہ کے رہنے والے تھے، عراق کے بہت بڑے عالم، محقق اور محدث تھے، علامہ ابوالحسن سندھی کبیر اور دوسرے علماء سے پڑھا اجازت اور سندیں حاصل کیں، مسجد حرام میں امام اور خطیب تھے۔ ان کے معروف شاگردوں میں شیخ جاراللہ لاہوری کے علاوہ، سید عبدالرحمن ابن سلیمان الاہدل بھی شامل ہیں، ۱۲۰۵ھ (۹۱-۱۷۹۰ء) میں مکہ مکرمہ میں وفات ہوئی۔ (۹)

أما بعد! فيقول راقم هذه الأحرف، أحقر العباد، وأفقرهم إلى مولاه الجواد محمد بن محمد صالح مير داد، أنه قد التمس مني الجناب المكرم والوهاب المعظم، الفاضل الكامل، العالم جامع أشتات العلوم النقلية والعقلية، حائز الكمالات الرضية والصفات المرضية، مولانا الشيخ جار الله ابن الشيخ عبد الرحيم الهندي، اللاهوري، زاده الله تعالىٰ من العلم اللّدني، والفيض النوري۔

بعد أسمعنی سورة البقرة من أولها إلی آخرها علی روایة حفص، عن الإمام عاصم مع مراعاة قواعد التجوید، الذی هو لتلاوة من أعظم اللوازم أن أجیزه علی ذلك فیما بقی من القرآن، وإن لم أکن من فرسان ذلك المیدان، فأجبته إلی ذلك حیث أنه دعاه حسن ظنه، إلی أنی من أهل تلك المسالك، وأجزته بما یجوز لی إجازته جمیعاً من علم التجوید والقراءات، أن توجه إلیها، فإنها لدیه من أسهل التوجهات۔

وإنی أروی جمیع ذلك من طریق الشاطبیة والتیسیر علی حسب الطاقة من التقریر والتحریر علی علامة عصره، وفرید دهره، ومصره مولانا الشیخ عمر ابن المرحوم الشیخ علی البصیر بقلبه، المجمع علی کمال عقله ولبّه، المالکی قبیلة، الحنفی مذهبا، المکی وطنا ومولداً۔

وقرأ هو علی مشائخ کثیرین! منهم الشیخ عبد المصری ومنه الشیخ علی بن سلیمان الدمتیوهی وقرأ الشیخ علی المذکور، علی الشیخ منصور بن علی، وقرأ هو علی الشیخ سلطان المزاحی، وقرأ المزاحی علی الشیخ سیف الدین الضریر، وقرأ هو علی الشیخ شحاذة الیمنی، علی الشیخ ناصر الدین الطبلاوی، علی الشیخ زکریا الأنصاری۔

وقرأ الشیخ زکریا علی جماعة، منهم الشیخ احمد بن أسد الأمیوطی وطاهر بن محمد النویری وقرأ ابن اسد والنویری، علی إمام الأقراء و بهجة القراء، وأفضل من کتب وقرأ ومن......شمس الدین أبی عبد الله محمد بن محمد بن محمد الجزری روح الله روحهم، ونور ضریحهم وزادهم من الکرامة ونفع بعلومهم إلی یوم القیامة۔

وسند الشیخ ابن الجزری مذکور فی کتابه النشر متصل فیه بسید البشر علیه وعلی آله وصحبه أفضل الصلوٰة والسلام۔

راجیا من المستجیز المذکور، صادف الله له الأجور أن لا ینسانی من صالح دعواته فی خلواته وجلواته۔ والسلام۔ حرره ذلك فی ۱۱/ذی القعدة الحرام [لعله] ۱۱۶۵ھ

(۴)

شیخ محمد (وفد اللہ) بن محمد بن سلیمان مغربی

شیخ (وفداللہ) ابن شیخ محمد بن محمد الرودانی، یہ علامہ محمد بن سلیمان مغربی رودانی کے فرزند ہیں، ان کا نام محمد اور لقب وفداللہ ہے، علمی حلقوں میں عموماً محمد وفداللہ کے نام سے متعارف ہیں، علامہ عبدالحی کتانی نے لکھا ہے، کہ ان کے حالات اور تذکرہ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے، بعض لوگوں نے ان کے وجود کا ہی انکار کردیا۔

''ولغرابة ترجمته بل خبره ربما أنكر وجوده بعض من لقيناه بالمشرق، قائلاً لعل رجلا دخل الهند فنسب نفسه إلى الرداني''(۱۰)

حضرت شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے، کہ میں نے پوری مؤطا حرفاً حرفاً شیخ وفداللہ سے پڑھی۔(۱۱)

حضرت شاہ ولی اللہ نے ایک اور موقع پر بھی اس کی صراحت فرمائی ہے۔

''ایں فقیر از محمد وفداللہ ابن شیخ مذکور اجازت جمیع مرویات والدش حاصل کردہ، بحق اخذہ عن والدہ قراءۃً وسماعاً واجازۃً ونیز مؤطا یحییٰ بن یحییٰ بتمامہ برایشاں خواندم''(۱۲)

شیخ محمد (وفداللہ) مکی ۱۱۴۹ھ (۳۷-۱۷۳۶ء) میں ہندوستان سفر کے دوران دہلی آئے تھے، حضرت شاہ ولی اللہ نے شیخ وفداللہ سے دہلی میں استفادہ کیا تھا۔

حضرت شاہ صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ میں ان کے یہاں صحیح بخاری کے نسخۂ یونینی کی زیارت کی ہے، (جس کو شیخ محمد بن سلیمان رودانی نے بہت بڑی قیمت دے کر خریدا تھا) علامہ عبدالحی کتانی کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ وفداللہ کی ۱۱۸۶ھ (۷۳-۱۷۷۲ء) میں وفات ہوئی۔(۱۳)

وبعد! فإني قد أجزت الأخ في الله والمحبوب من أجل الله، الشيخ الكامل إن شاء الله تعالىٰ، الحاوي جميع الفضائل بعونه تعالىٰ، الشيخ جار الله بن عبد الرحيم الهندي اللاهوري، المجاور بالمدينة المنورة على ساكنها أفضل الصلوٰة وأزكى السلام! بجميع الكتب الستة والمسانيد والمعاجم وغيرها من سائر الكتب الحديثية۔

وبجميع الكتب العلمية على حسب ما أجازني بذلك جمع من المشائخ ذوي الأقدار العلية بالشروط الجارية على الطرق المرضية، من لزوم التقوىٰ و كمال التثبت والعناية بمتابعة السنة السّنيّة وعلى أن يدعو لي بصالح الدعوات، عند ما يذكرني في الخلوات أو الجلوات۔

فأما إسنادى إلى الإمام الجليل محمد بن إسماعيل البخارى رحمه الله تعالىٰ، فمن طرق متعددة ومن أعلاها وأكملها وأجلها ما أجازنى به، شيخ شيوخنا إجازة منه عند ما قرأت عليه، جميع أوائل كتب الحديث! أعنى به شيخنا الجليل الحافظ العلامة المثيل الشيخ عبدالله بن سالم المكى عن شيخ البابلى، عن أبى النجا سالم بن محمد السنهورى، عن محمد بن أحمد بن على عن شيخ الإسلام زكريا، عن شيخ السنة أبى الفضل بن حجر، عن الأستاذ إبراهيم بن أحمد التنوخى، عن أبى العباس أحمد بن أبى طالب الحجار، عن السراج الحسين بن المبارك الزبيدى، عن أبى الوقت عبد الأول الهروى، عن أبى الحسين عبدالرحمن بن محمد الداودى، عن أبى محمد عبدالله بن أحمد السّرخسى، عن محمد بن يوسف الفربرى، عن أمير المؤمنين فى الحديث محمد بن إسماعيل البخارى۔

ومن أجلهما أيضا، ما حدثنى به والدى المرحوم يكرم الله تعالىٰ الشيخ محمد بن عبد الله المغربى منشأً، المدنى سكناً، عن شيخه العلامة سيدى عبد السلام بن حمدون حبسوس عن شيخه سيدى عبد القادر الفاسى، عن عمه الولى الصالح سيدى عبد الرحمن الفاسى، عن شيخه سيدى محمد القصار، عن شيخه أبى عبدالله محمد بن خروف التونسى، عن الكمال الطويل القادرى، عن الحجازى أبى المجد عن الحجار، عن الزبيدى، عن أبى الوقت، عن الداودى، عن السرخسى، عن الفربرى، عن البخارى رحمه الله تعالىٰ ورضى عنه وأرضاه۔

وأرويه أيضا عن المرحوم المبرور، الشيخ محمد حياة السندهى، وهو يرويه عن الشيخ عبدالله بن سالم المذكور سابقاً وعن غيره من المشائخ، كما هو معروف فى ثبتهم أى مصنفهم فى بيان الطرق والسندات رضى الله تعالىٰ عنهم۔ وأما رواية مسلم وغيره من الكتب فأرويها من طرقهم المعروفة فى سنداتهم، فمن أرادها فليطلبها من ثبت الشيخ حسن العجيمى، والشيخ الجعفرى الثعالبى، والشيخ محمد بن سليمان المغربى، والشيخ إبراهيم الكورانى الكردى، تغمده الله جميعهم بالرحمة

والغفران، وأسكنهم فی أعلی علیین من فسیح الجنان، وأدخلنا معهم والمسلمین أجمعین فی میادین الرحمة والرضوان، تجاه قرة أعیننا سید ولد عدنان، محمد المبعوث رحمة والمخصوص بالشیم الحسان، علیه أکمل الصلوٰة وأفضل السلام من اللہ الجلیل الملك الدیان۔

قاله بفمه و کتبه بقلمه، أسیر ذنبه والراجی عفو ربه، تراب أقدام العلماء محمد بن محمد بن عبد اللہ المغربی نسباً والمدنی سکنا والمالکی مذهباً۔

حرر فی یوم الجمعة عاشر شوال ۱۱۶۹ھ وصلی اللہ علی سیدنا محمد وآله وصحبه وسلم تسلیماً۔

(۵)

سند واجازت شیخ اسماعیل بن عبداللہ رومی، نقشبندی

شیخ اسماعیل بن عبداللہ الاسکداری، حنفی مہاجر مدنی نے شیخ عبدالغنی نابلسی، شیخ عبداللہ بن سالم بصری وغیرہ جلیل القدر علماء اور محدثین سے تعلیم حاصل کی، علم وفضل میں بہت بڑا مرتبہ پایا، مسجد نبویؐ شریف میں درس دیتے رہے، جہاں ان سے بے شمار علماء نے استفادہ کیا، تقریباً ۱۱۶۰ھ (۱۷۴۷ء) میں مدینہ طیبہ میں وفات ہوئی، بقیع میں دفن ہوئے۔(۱۴)

وبعد! فیقول العبد الفقیر إلی مولاه الغنی القادر، إسماعیل بن عبد اللہ الرومی، النقشبندی، کان اللہ له فی جمیع حرکاته وسکناته وجمیع أحواله ولمن والاه فی اللہ رب العالمین۔

أن الشیخ الفاضل، جار اللہ بن الشیخ عبد الرحیم الهندی، قرأ علی القرآن العظیم من أول الفاتحة إلی قوله تعالیٰ: أتامرون الناس بالبر الآیة] وسورة الکهف تماماً و شئ......جزئین من تبارك الذی بیده الملك إلی آخره القرآن بالتجوید به مضمن الجزریة علی قراءة حفص، راوی عاصم رحمهم اللہ تعالیٰ! وسمع منی جمع الفوائد لجامع الأصول ومجمع الزوائد المشتمل علی أربعة عشر مصنفا فی الحدیث الشریف، تالیف شیخ الجماعة الشیخ محمد بن سلیمان المغربی المکی رحمه اللہ تعالیٰ، سمع بعض

أواخره وقرأ بعضا، وقرأ علی أیضا أوائل الکتب الحدیثیة، وأسمعنی ذلك من لفظه، ثم إنه لحسن نیته وسلامة طویته وخلوص شِنشنَته، طلب منی الإجازة فیما تحمله ولی فیه الإجازة من الشیوخ الأجلاء الأعلام، حملة دین الإسلام وأحادیث النبی الکریم علیه أفضل الصلوٰة وأزکی السلام، فاستخرت الله تعالیٰ وأجبته فی طلبته وأسعفته فی حسن نیته، والأعمال بالنیات ولکل امرئ ما نویٰ، فأقول مستعینا بالله سبحانه أنی قد أجزت المشار إلیه، أدام الله نعمه وتوفیقه علیه الشیخ جار الله الهندی فی جمیع ما یجوز لی روایته فی القرآن و کتب القراء ۃ المعتبرة کالشاطبی والجزریة، وفی تلاوة القرآن والإکثار منه آناء اللیل وأطراف النهار، کما رأیته أهلا للنطق والفهم الصحیح بعد التأمل والإتقان ولزوم التقویٰ والإخلاص لله مع کمال الإحسان ومراقبة الله فی السر والإعلان مع التأمل والتدبر فی معانی القرآن، جعلنا الله وإیاه من أهل القرآن۔

حواشی

(۱) مکتوبات کے لئے دیکھیے: مجموعۂ مکتوبات مرتبہ: مولانا شاہ عبدالرحمن پھلتی (فرزند شاہ محمد عاشق وشاگرد حضرت شاہ ولی اللہ) اس کا حصہ دوم مولانا شاہ محمد عاشق کی تالیف ہے۔ مصنّفین کے مکتوبہ نسخے راقم سطور کے سامنے ہیں۔

(۲) ترجمہ مجموعۂ مکتوبات (مولانا نسیم فریدی، پھلت ۱۹۹۸ء) کا شمار اور صفحات کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔مکتوب: چورانوے ۹۴ ص: ۲۰۱-۲۰۰، ج:۲۔ ۲۔مکتوب: ایک سوبارہ، ۱۱۲، ص: ۲۴۷-۲۴۶، ج:۲۔ ۳۔مکتوب: ایک سوباسٹھ ۱۶۲ ص: ۳۳۵-۳۳۴، ج:۲۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب نے ان مکتوبات میں سے تیسرے خط کو ''شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات'' ص: ۷۳ (ندوۃ المصنّفین، دہلی، طبع اول فارسی خطی: ۱۳۸۸ھ/۱۹۶۹ء) میں شامل کیا ہے، مگر نظامی صاحب نے اس خط کے دوتہائی حصہ کو بالکل نظرانداز اور حذف کردیا ہے۔

نظامی صاحب نے اصل مجموعۂ مکتوبات جو ایک نادرترین اور منحصر بفرد نسخہ ہے، اس کو اس طرح استعمال نہیں کیا، بلکہ اس کو ایک رف اور شاید معمولی نسخہ کی طرح دیکھا اور اسی طرح استعمال بھی کیا۔ جس احتیاط، حفاظت اور قدرومنزلت کے ساتھ دیکھنا اور استفادہ کرنا چاہیے تھا، اس کا نظامی صاحب کے یہاں اس کتاب میں تصور بھی

نہیں۔اس پر جگہ جگہ کچی پنسل سے، کالی روشنائی سے اور غالباً لکڑی کے قلم سے نشان ڈال دیئے ہیں، اقتباس نقل کرنے کے بعد اس پر بڑا سا، صاد کا نشان بنا دیا ہے اور بھی کچھ ایسے نشانات ملتے ہیں، جس سے نسخۂ مصنف کو بہت زیادہ نقصان پہنچا ہے اور اس کی قدر و قیمت کم ہوئی، یہ تو وہ ظاہری نقصان تھا جو اس نسخہ کو پہنچا۔

بڑا اندرونی نقصان یہ ہے کہ نظامی صاحب نے جملہ خطوط میں سے صرف وہ اقتباسات لے لئے ہیں، جس کو سیاسی طور پر مرتب کیا جا سکتا تھا، اس اقتباس سے آگے پیچھے کے جو حصے تھے، ان کو پوری طرح نظر انداز کر دیا ہے۔اس کے مندرجات و متعلقات کا بالکل بھی تذکرہ نہیں کیا، آخری اور تیسرا تکلیف دہ مرحلہ یہ ہوا ہے کہ جب مولانا نسیم احمد صاحب فریدی نے ان مکتوبات کو مرتب کیا، تو اس وقت بھی ان تمام عبارتوں کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا، جو نظامی صاحب نے اپنی کتاب میں لے لی تھیں۔

اس طرح دونوں ہی نسخے اور اشاعتیں بے حد ناقص رہ گئیں۔نسخہ مرتبہ و مترجمہ مولانا فریدی میں حضرت شاہ ولی اللہ کے کچھ ایسے مکتوبات بھی شامل ہو گئے، جو اس مجموعۂ مکتوبات کا حصہ نہیں تھے، یہ مکتوبات اس مجموعہ کے علاوہ تھے، ان کو ضمیمہ میں علیحدہ شائع کیا جانا چاہیے تھا، ایسے خطوط کو اس مجموعہ میں بے موقع شامل کرنے سے، اصل نسخہ کی علمی، استنادی حیثیت کم ہوئی ہے اور اس کی صحیح ترتیب پر اعتماد بھی کمزور ہو گیا۔

مکتوبات ولی اللّٰہی کے حوالہ سے اس فروگذاشت پر، میں پہلے مضامین میں بھی توجہ دلا چکا ہوں، کیوں کہ مکتوبات حضرت شاہ ولی اللہ ایک بہت اہم تاریخی، دینی، علمی حوالہ ہے، جس سے حضرت شاہ ولی اللہ کے احوال و خدمات کے علاوہ، اس عہد کی سیاسی تاریخ اور عروج و زوال کے تذکروں کے لئے، کثرت سے استفادہ کیا جاتا ہے، ایسے موقعوں پر، حقیقت کے نہ جاننے کی وجہ سے اس میں غلط فہمی کا خاصا خطرہ ہے۔اس لئے یہاں یہ وضاحت ضروری سمجھی گئی۔

اصل خطی (نسخہائے مصنّفین) میں شیخ جار اللہ کے نام مکتوبات کا شمار اس طرح ہے:

۱۔دوسو (۲۰۰) ۲۔دوسوانیس (۲۱۹) ۳۔دوسواکیاسی (۲۸۱)۔

لیکن مجموعہ مکتوبات: مرتبہ مولانا نسیم احمد صاحب فریدی (رام پور ۱۴۲۵ھ/۲۰۰۴ء) میں ان کی ترتیب بدل گئی ہے، اس کا تذکرہ گزر گیا ہے کہ وہاں شمار کی ترتیب یہ ہے:

۱۔مکتوب: چورانوے (۹۴) ص: ۳۴۳، جلد: ۲۔ ۲۔مکتوب: ایک سو بارہ (۱۱۲) ص: ۳۷۳، جلد: ۲۔ ۳۔مکتوب: ایک سو باسٹھ [۱۶۲] ص: ۴۲۸/ جلد: ۲۔

(۳) تحفة المحبين والأصحاب فی معرفة ما للمدنيين من الأنساب (شیخ عبدالرحمٰن انصاری)

تحقیق: محمد العروسی، ص ۴۹۳، مکتبہ عتیقہ جامعہ زیتونیہ، تیونس، بلاسنہ۔ (۴) اس سند کو مولانا عبید اللہ سندھی نے اپنی مرتبہ مسوی شرح موطا حضرت شاہ ولی اللہ (دار السّلفیہ، مکہ مکرمہ ۱۳۵۱ھ/۳۳-۱۹۳۲ء) کے آغاز پر، تمہید کے ساتھ شائع کیا تھا مگر مولانا سندھی نے یہ صراحت نہیں کہ ان کا ماخذ کیا ہے، میرے سامنے خود شیخ جار اللہ کے قلم کا مکتوبہ مجموعہ ہے، مجھے اس نادر نسخہ کا عکس مدینہ منورہ کے ممتاز فاضل، محقق و محدث شیخ احمد عبد الملک، عاشور حفظہ اللہ ورعاہ نے ارسال فرما کر حد درجہ ممنون کیا۔ فجزاہ اللہ تعالیٰ خیر الجزاء (۵) شیخ عمر، علامہ عبداللہ بن سالم بصری کے نواسہ ہیں، علامہ مرتضیٰ زبیدی اور علامہ عابد سندھی نے ان کو ابن اخت الشیخ سالم بصری فساخ لکھا ہے، مگر دونوں کو وہم ہوا، صحیح ابن بنت الشیخ ہے، جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ نے اتحاف النبیہ، فارسی ص: ۴ (لاہور: ۱۳۸۹ھ) اور الإرشاد إلی مهمات علم الإسناد ص: ۵ (طبع اول، احمدی، دہلی، بلاسنہ) میں صراحت کی ہے اور علامہ عبدالحی کتانی نے اس پر مفصل بحث کر کے، ان لوگوں کا غلط ہونا ثابت کیا ہے جو ابن بنت الشیخ کے علاوہ کسی اور رشتہ کی بات کرتے ہیں۔ فہرس الفہارس: ص ۷۹۲، ۷۹۶ جلد ثانی (دار الغرب الاسلامی بیروت: ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء)۔ (۶) شیخ عبداللہ مرداد ابوالخیر نے شیخ عمر بن بنت الشیخ کی تاریخ وفات ۱۲/شوال ۱۱۷۱ھ (۵۸-۱۷۵۷ء) کی صراحت کی ہے اور لکھا ہے کہ وہ المعلاۃ، مکہ مکرمہ میں، شیخ عبداللہ بن سالم بصری کے قریب دفن کئے گئے۔ نشر النور والزہر ص: ۳۷۶، (عالم المعرفۃ جدہ: ۱۴۰۶ھ/۱۹۸۶ء)۔

(۷) اشبولی نسبت کو علامہ مرتضیٰ زبیدی نے لام اور یاء کے ساتھ اشبولی لکھا ہے، شیخ مرداد ابوالخیر نے نشر النور والزہر میں، ص: ۴۷، (جدہ ۱۴۰۶ھ/ ۱۹۸۶ء) میں نون اور یاء کے ساتھ اشبونی لکھا ہے، بظاہر وطنی نسبت اور سنہ وفات دونوں میں علامہ زبیدی کی اطلاع زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے، کیوں کہ وہ شیخ اشبولی کے شاگرد تھے، خود زبید میں مقیم تھے، اس لئے علامہ زبیدی شیخ اشبولی کے احوال سے زیادہ واقف ہوں گے۔ (۸) المختصر من کتاب نشر النور والزهر، ص: ۴۹۰۔

فيض الملك الوهاب المتعالى، شيخ عبد الستار بن عبد الوهاب البكرى المكى ص: ۱۳۷۹، جلد: ۲ (مكتبه الاسدى مكه مكرمه: ۱۴۲۹ھ/ ۲۰۰۸ء)

(۹) فہرس الفہارس، عبدالحی کتانی ص: ۴۲۸، جلد: ۱، دار الغرب الاسلامی، بیروت: ۱۴۰۲ھ/ ۱۹۸۲ء۔ (۱۰) اتحاف النبیہ (فارسی) ص: ۱۱۷، ۱۱۹ (طبع اول، لاہور: ۱۳۸۹ھ، ۱۹۶۹ء)۔ (۱۱) انسان العین فی مشائخ الحرمین، ص: ۱۸۴، (مشمولہ انفاس العارفین، مطبع احمدی، دہلی بلاسنہ)۔ (۱۲) فہرس الفہارس کتانی، ص: ۴۲۹، ج: ۱۔ (۱۳) سلک الدرر، محمد خلیل مرادی، ص: ۲۵۰، جلد: ۱ (دار الکتب العلمیۃ، بیروت: ۱۴۱۸ھ/ ۱۹۹۷ء)۔

سلسلۂ خواجہ بندہ نوازؒ کے معروف صوفیائے کرام اور ان کی علمی و ادبی خدمات

☆ڈاکٹر راہی فدائی

حضرت سلطان القلم خواجہ بندہ نوازؒ گیسو دراز قدس سرہ (ولادت: ۲۰/۷/۲۱ ۷ھ مطابق ۱۳۲۱ء، وصال: ۸۲۵ھ/ مطابق ۱۴۲۱ء) کے سلسلۂ چشتیہ کا یہ خصوصی امتیاز ہے کہ اس کے خلفا و اولیا دل کے غنی اور قلم کے دھنی رہے ہیں۔ یہ وصف خاص سلسلۂ بندہ نواز میں تا حال جاری و ساری ہے اور ان شاء اللہ تا قیام قیامت باقی رہے گا۔ راقم الحروف کی تحقیق میں برصغیر کے تمام سلاسل صوفیہ میں اس نعمت عظمیٰ سے بہرہ ور ہونے کی سعادت صرف سلسلۂ بندہ نواز کے مقدر کا حصہ بنی ہے۔ یہی وہ بابرکت سلسلہ ہے جس کے بزرگان دین نے قوم و ملت کی رشد و ہدایت کے لئے نہ صرف حصولِ علم کے دونوں شعبوں تقریر و تحریر کو یکجا کیا بلکہ علوم و معارف کی تفہیم و تدریس کا بھی مستقل اہتمام فرمایا۔ خصوصاً بندہ نوازی سلسلۂ عالیہ کے مؤسس و بانی حضرت گیسو دراز بندہ نواز ابوالفتح خواجہ سید شاہ محمد حسینی بن قدوۃ السالکین و زبدۃ العارفین حضرت سید شاہ یوسف حسینی راجا المعروف بہ راجو قتّال (متوفی ۷۳۱ھ) خلیفۂ اجل حضرت خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی قدس سرہ (متوفی ۷۵۷ھ) نے اپنی ایک سو پانچ سالہ طویل حیات طیبہ میں تلقین و تقریر کے جواہر بکھیرنے کے ساتھ ہی عربی، فارسی اور اردو میں بقول ان کے خادم خاص حضرت مولانا شاہ محمد علی سامانیؒ مصنف سیر محمدی (مرقومہ ۸۳۱ھ) ''ایک سو پانچ کتب و رسائل بھی تصنیف فرمائیں''۔ اس عظیم الشان ذخیرۂ کتب میں سے نموناً بعض تصانیف کا ذکر یہاں بیجا نہ ہوگا۔ ۱۔ تفسیر الملتقط (عربی) صوفیانہ طرز پر تحریر کردہ قرآن کریم کی تفسیر جس کا واحد مخطوطہ انڈیا آفس، لندن کا مخزونہ ہے۔ ۲۔ حواشی تفسیر کشاف (عربی) علامہ زمخشری کی ضخیم تفسیر پر تحریر کردہ

☆ گراؤنڈ فلور B-2nd کراس، 4th بلاک، HBR لے آؤٹ، بنگلور۔43، کرناٹک Mob:9448166536

حواشی ۔ ۳۔شرح مشارق (عربی) حدیث کی مشہور کتاب ''مشارق الانوار'' کی شرح ۔ ۴۔معارف العوارف (عربی) حضرت سید شہاب الدین سہروردیؒ کی بلند پایہ تصنیف ''عوارف المعارف'' کی تقریباً گیارہ سوصفحات پر مشتمل مبسوط شرح جس کا واحد نسخہ ٹونک کے کتب خانے کی زینت ہے۔ ۵۔شرح فصوص الحکم (عربی) حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ کی شاہکار تصنیف کی بے نظیر شرح۔ ۶۔شرح تمہیدات (عربی) حضرت ابوالمعالی عبداللہ المعروف بہ عین القضاۃ ہمدانی کی مؤقر تصنیف کی لاجواب شرح۔ ۷۔شرح آداب المریدین (فارسی) حضرت شیخ ضیاء الدین عبدالقاہر سہروردیؒ کی کتاب ''آداب المریدین'' کی شرح۔ (۸) رسالہ سیر النبی صلی اللہ علیہ وسلم (فارسی)۔ ۹۔اسماء الاسرار (فارسی) حقائق ورموز تصوف پر مشتمل اعلیٰ معیاری تصنیف جس کی ستائش خود مصنف نے کی ہے۔ ۱۰۔انیس العشاق (فارسی دیوان) جس میں جملہ ۳۲۷ غزلیں، ۲۶/اشعار کی مثنوی، ۹/رباعیات شامل ہیں، اس وقیع دیوان کو ان کے پوتے حضرت خواجہ سید یداللہ حسینی عرف خواجہ قبول اللہ چشتی ابن حضرت خواجہ سید محمد اصغر حسینی چشتی نے مرتب کیا تھا۔ ۱۱۔شکارنامہ (دکنی نثر)۔ ۱۲۔رسالہ سہ پارہ (دکنی نثر)۔ ۱۳۔ہدایت نامہ (دکنی نثر)۔ ۱۴۔تمثیل نامہ (دکنی نثر)۔ ۱۵۔حقیقت گیت (دکنی نظم)۔ ۱۶۔چکی نامہ (دکنی نظم)۔ ۱۷۔سہاگن نامہ (دکنی نظم) حضرت بندہ نوازؒ کو عربی، فارسی اور دکنی کے علاوہ سنسکرت زبان میں بھی بڑی حد تک درک تھا۔ بقول پروفیسر نثار احمد فاروقی:

> ''خواجہ صاحب کی اکثر تصانیف فارسی میں اور بعض عربی میں ہیں، ان کے علاوہ آپ کا ہندوی (دکنی) کلام بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہندوستانی زبان اور محاورے سے آپ پوری طرح واقف تھے اور ''جوامع الکلم'' سے ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے کسی قدر سنسکرت بھی پڑھی تھی اور اس کی بعض کتابوں کا مطالعہ بھی کیا تھا۔'' (۱)

حضرت خواجہ بندہ نوازؒ علوم شرائع اور رموز وحقائق کے جامع تھے، جیسا کہ ان کی تصنیفات سے واضح ہے، علاوہ ازیں ان کی ذات والا صفات اولیا عارفین وصوفیائے کاملین کے درمیان ان معنوں میں ممتاز ومنفرد تھی کہ سلطان فیروز شاہ بہمنی (۸۰۰ تا ۸۲۶ھ) کی درخواست پر ۸۰۱ھ میں دہلی سے گلبرگہ آپ کی تشریف آوری شمال وجنوب کے درمیان دینی، علمی، لسانی اور ادبی مضبوط ومستحکم روابط و تعلقات کی اساس بنی، جس کے مثبت نتائج وخوشگوار اثرات صدیوں بعد بھی محسوس کیے جارہے ہیں۔

چنانچہ ان کی کتابوں سے استفادہ کا عمل تاحال مسلسل جاری ہے اور زبان اردو کے اولین شاعر کی حیثیت سے ادبی دنیا میں مسلّم ہیں۔ یہاں بطور مثال چند مثلث پیش کئے جا رہے ہیں:

او معشوق بے مثال ہے نور نبیؐ نپایا نور نبیؐ رسول کا میرے جیو میں بھایا

اپس کو اپیں دکھانے کیسی آرسی لایا کل شئی محیط ہے اسی کوں پچھانے

جو کوئی عاشق اس پیو کے اسے جیو میں جانے اسے دیکھت گم ہو رہے ہیں جیسی ہیں دیوانے

کھڑے کھڑے پیو جیو میں ایسی آپ دکھاوے

ایسے میٹھے معشوق کوں کوئی کیوں دیکھ پاوے

جسے دیکھے اسے کوئی نہ بھاوے

خواجہ نصیر الدین چنے سائیاں پیو بتائے

جیو کا گھونگھٹ کھول کر پیا مکھ آپ دکھائے

آکھے سید محمد حسینی پیو سنگھ کہیا نہ جائے (۲)

راہ طریقت میں عموماً اہل تصوف کا یہ مزاج رہا ہے کہ وہ ہمیشہ حقوق العباد پر بصمیم قلب گامزن رہے ہیں۔ خصوصاً سلسلۂ چشتیہ کے نصاب میں خدمت خلق کو اولیت حاصل ہے، جیسا کہ کہا گیا:

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست نہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

یہی وجہ ہے کہ مختلف اعتقادات کے حاملین اور متضاد طبقات کے متعلقین ان آسودۂ خاک بزرگوں کی بارگاہوں میں حاضر ہونے کو سعادت تصور کرتے ہیں اور ان نفوس قدسیہ سے اپنی استعداد کے مطابق ظاہری و باطنی فیضان بفضل رب پاتے ہیں۔ اس ضمن میں راقم الحروف کا ایک چشم دید واقعہ قابل ذکر ہے۔ ایک مرتبہ راقم نے اپنے استاذ و مرشد شیخ التفسیر حضرت علامہ سید شاہ عبدالجبار باقوی نیشاپوری علیہ الرحمہ (متوفی ۲۰۰۳ء) جن کی تدریسی خدمات ام المدارس مدرسۂ باقیات صالحات ویلور (تمل ناڈو) میں نصف صدی پر محیط ہیں، کے ہمراہ گلبرگہ شریف پہنچ کر خواجہ بندہ نوازؒ کی درگاہ میں حاضری دی، راقم کے ساتھ مولانا مولوی محمد یحییٰ باقوی بھی تھے، ہم دونوں فاتحہ و دعا سے فارغ ہوکر باہر صحن میں حضرت شاہ صاحب قبلہ کا انتظار کرنے لگے، حضرت والا بہت دیر بعد پسینے سے شرابور تشریف لائے مگر آپ کے چہرے پر بہجت و مسرت کا عکس جمیل نمایاں تھا اور نورانیت کے

جلوے ان کی خندہ پیشانی پر رقص کناں تھے۔ پھر ہم درگاہ شریف کی مسجد میں آ بیٹھے، راقم نے بڑے ادب و احترام کے ساتھ حضرت شاہ صاحب قبلہ سے تاخیر کی وجہ دریافت کی تو انھوں نے کچھ توقف کے بعد فرمایا کہ میں وہاں مراقب تھا، خواجہ بندہ نوازؒ کی توجہات اپنی طرف نہ پاکر بے حد حیران و پریشان ہو گیا، اسی عالم اضطراب میں تھوڑا وقت گذرا پھر اچانک حضرت بندہ نواز قدس سرہ کی جانب سے سلام کا جواب ملا اور انھوں نے بڑی شفقت اور محبت سے فرمایا میں رب تعالیٰ کی بارگاہ میں نماز ادا کر رہا تھا، اس لئے تمہاری طرف متوجہ نہ ہو سکا۔

الغرض حضرت بندہ نوازؒ کی خدمات دینی، علمی اور ادبی اعتبار سے ناقابل فراموش ہیں۔ ان کے انہیں کارناموں کے سبب سلسلۂ چشتیہ کو فروغ حاصل ہوا۔

شاہ میراں جی شمس العشاق: اسم گرامی سید امیر الدین بیجاپوری، عرفیت شاہ میرانجی اور لقب شمس العشاق ہے اور ذات اقدس سلسلۂ بندہ نواز کی اہم مضبوط کڑی اور ایک زرین حلقے کی حیثیت رکھتی ہے، ولادت تقریباً ۸۶۶ھ مطابق ۱۴۶۱ء میں بمقام مکہ مکرمہ ہوئی، والد کا اسم گرامی سید حاجی شریف دوام الدین بن سید علی مکی تھا، والدہ ہندوستان کے چغتائی خاندان کی ایک معزز خاتون تھیں، شمس العشاق جوانی کے عالم میں جبکہ ان کی عمر ۲۲ سال تھی، بتوفیق الٰہی مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ پہنچے، مدینہ میں ان کا قیام بارہ سال تین ماہ اور پانچ دن تھا جیسا کہ انھوں نے اپنی مختصر خود نوشت تحریر میں بیان کیا ہے۔ (۳) ان کے روز و شب کی ساعتیں حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ عالی میں ہی گزرتی تھیں، انھوں نے سوتے ہوئے کبھی روضہ اقدس کی طرف پشت نہیں کی تاکہ کہیں سوئے ادب کا اندیشہ لاحق نہ ہو جائے۔ قیام مدینہ طیبہ کے زمانے میں انھوں نے بارہ حج کئے، ایک روز شب جمعہ کے موقع پر عالم رؤیا میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف حاصل ہوا، آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو ہندوستان جانے اور شاہ کمال الدین بیابانیؒ کی خدمت میں رہنے کی ہدایت فرمائی۔ شاہ کمال الدین بیابانی حضرت شاہ جمال الدین مغربی (متوفی ۸۲۰ھ مطابق ۱۴۱۷ء) کے خلیفہ مجاز تھے اور شاہ مغربی کا شمار خواجہ بندہ نواز علیہ الرحمہ کے ممتاز خلفا میں ہوتا تھا۔ حضرت شمس العشاق بحکم نبویؐ سلطان عادل شاہ اول کے عہد حکومت (۹۶۵ھ مطابق ۱۵۵۷ء تا ۹۸۸ھ م ۵۸۰ء) میں بیجاپور تشریف لائے اور شاہ کمال الدین بیابانی کی خدمت میں رہ گئے۔ شاہ بیابانی نے ان کو تمام منازل سلوک طے کرانے کے

بعد سلسلۂ چشتیہ میں اجازت وخلافت سے سرفراز کرتے ہوئے حکم صادر فرمایا کہ مقام ''بھنگار'' میں جا کر نکاح کرو، جس سے ایک فرزند ''برہان'' تولد ہوگا اور وہ قطب الاقطاب ہوگا۔شاہ معظم بیجاپوری مرید حضرت امین الدین اعلیٰ نے اپنی مثنوی ''شجرۃ الاتقیاء'' میں اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔

قبول شرع کد خدائی کرو کبتک کام سوں اب جدائی کرو
ترت ایک فرزند اب ہووے گا بڑا قطب اقطاب وہ ہووے گا
لیکھا لوح پر نام برہان ہے ملائک کتے ظلِ سبحان ہے
اسے راز مکشوف ہوگا تمام پرستش کرے گا اسے خاص وعام (۴)

چنانچہ شمس العشاق نے حکم مرشد کی تعمیل میں بندہ نواز کی طرح چالیس سال کی عمر میں شادی کی ،اس دوران انھوں نے مقامی بولی اور عوامی زبان (دکنی) بھی خوب سیکھ لی۔جب ان کے علم و عرفان اور زہد وتقویٰ کی شہرت چاروں طرف پھیل گئی تو اس سے متاثر ہوکر لوگ جوق در جوق ان سے رشد وہدایت حاصل کرنے اور پند ونصیحت سننے کے لئے جمع ہونے لگے۔نتیجتاً ان کے محبین ومعتقدین کا حلقہ کافی وسیع ہوگیا، باوجود عبادات اور اوراد ووظائف کے اشاعت اسلام اور ترویج احکام میں شب وروز مشغول رہتے اور عوام وخواص کی ہدایت ورہنمائی میں ہمہ تن مصروف ہوجاتے،اس تمام عرصہ میں بیجاپور کے قریب واقع علاقہ شاہ پورؔ کے ایک ٹیلے پر قیام پذیر رہے اور وہیں ۹۷۰ھ م ۱۵۶۲ء میں واصل بحق ہوگئے۔انتقال کے وقت موصوف کی عمر ایک سو چار سال تھی،شاہ معظم نے اپنے ایک شعر میں رحلت کے وقت ان کی عمر شریف کی اطلاع دی ہے۔

اربع پوسوں سال ماہے کوں شوال ہے رحلت کئے اس حال ہے جسے کچھ حکم الٰہی کا (۵)

میراں جی شمس العشاق علوم ظاہری کے عالم وفاضل اور علوم باطنی کے ماہر وکامل بزرگ تھے،بقول ڈاکٹر مولوی عبدالحق:

> ''حضرت میراں جی اگرچہ بہت بڑے عالم تھے مگر وہ اکثر طلبہ کے درس اور عام تلقین میں اس زبان سے کام لیتے تھے جو اس وقت ہندی کہلاتی تھی اور جسے ہم ابتدائی اردو کہتے ہیں۔وہ اس زبان کے شاعر بھی تھے،چنانچہ اس زبان میں ان کے نظم ونثر کا کلام اب تک موجود ہے۔''(۶)

تصنیفات میں: ۱۔خوش نامہ (نظم)۔ ۲۔خوش نغز (نظم)۔ ۳۔شہادت الحقیقت (نظم)۔ ۴۔مغز مرغوب (نظم)۔ ۵۔چہار شہادت (نظم) وغیرہ کتابیں علم تصوف میں کتب ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔مذکورہ رسائل سے چند شعر ملاحظہ ہوں:

اللہ محمد علی امام دایم ان سوں حال	سب خاصوں اللہ اللہ تو آ کہوں گیان کمال
جے ہماری ارادت کی ان کا یہ احکام	نماز، تسبیح، نیتیاں، ذکر اللہ یک نام
بالی بھولی جیو جھوالی محبت کرا نور	پرم پیاری سات سنگھاتی تلنا ہوے دور (۷)

حاصل کلام یہ کہ میراں جی شمس العشاق نے اپنی طویل حیاتِ مستعار میں شریعت و طریقت کی تفہیم و تشریح کے لئے ایک نیا دلکش اسلوب اپنایا جس سے چشتیہ طریقہ سے استفادے کی راہ آسان ہوگئی اور اہل تصوف کے ارشاد و احسان کی دعوت کو تقویت پہنچی۔

حضرت سید شاہ برہان الدین جانمؔ: اسم گرامی سید برہان الدین اور تخلص جانمؔ ہے۔ جانمؔ تخلص کے متعلق ڈاکٹر محمد جمال شریف نے یہ توجیہہ پیش کی کہ ''شاید والد نے محبت اور پیار کی وجہ سے ''جانم'' کہہ کر پکارا جو نام کا جز بن گیا اور اس کو انہوں نے تخلص کے طور پر بھی استعمال کیا''۔(۸) حضرت جانمؔ اپنے والد خواجہ میراں جی شمس العشاق بن حضرت حاجی شریف دوام الدین کے جانشین و خلیفہ تھے، والد ماجد انہیں ابتدائی تعلیم و تربیت سے آراستہ کرتے ہوئے پندرہ سال کی عمر میں بیعت سے مشرف کیا اور پھر حکم دیا کہ سفر پر نکلنے کے لئے کمر بستہ ہو جائیں تا کہ مختلف اساتذہ و شیوخ سے استفادے کا موقع نکل آئے۔ چنانچہ تعمیل حکم میں حضرت جانمؔ نے اس کم عمری میں وطن کو خیر باد کہا اور سفر کی تکالیف برداشت کرتے ہوئے تین سال بعد وطن کی راہ لی۔ جب گھر پہنچے تو والد بزرگوار حضرت شمس العشاق نے بڑی محبت اور خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کیا، سینے سے لگایا اور تھوڑی سی مدت میں آپ کو مزید حقائق و معارف اور تصوف کے دیگر رموز و لطائف سے مستفیض فرما کر اپنے دست حق پرست سے خرقۂ خلافت پہنایا۔ ان کی عمر تقریباً بیس بائیس سال تھی کہ والد اس دار فانی سے ۹۷۰ھ/ ۹۷۲ھ میں رحلت فرما گئے۔(۹)

برہان الدین جانمؔ ایک بلند پایہ عالم اور قطب وقت تھے،انھوں نے اپنے والد کی تربیتی و اصلاحی تحریک کو بہت آگے بڑھایا اور اپنی تقریر و تحریر کے ذریعہ ہزاروں کی اصلاح فرمائی، ان کے

معتقدین ومسترشدین کی تعداد بہت زیادہ تھی جیسا کہ شاہ معظم بیجاپوری نے اپنی مثنوی میں بیان کیا ہے:

مریداں اتھے شاہ کے بے شمار فقیراں اتھے شاہ کے کئی ہزار

ان کے خلفا میں وقت کے جید علما اور اعلیٰ مقام صوفیا شامل تھے جن میں شیخ محمودؒ خوش دہاں، شاہ غلام محمود داولؒ، شاہ خداوندؒ، شیخ خان میاں، شاہ محمد اسحاق، شاہ رن سنگار خان اور قاضی بحر الدین کے اسماء گرامی تاریخ کے صفحات پر تابندہ ہیں۔(۱۰) حضرت جانمؒ نے نہ صرف اصلاح امت اور اشاعت سنت کے ذریعہ اپنے بزرگوں کی روایت کو زندہ رکھا بلکہ رشد وہدایت کے لئے اپنی تصنیفات میں ایسا اسلوب اختیار کیا جو سادہ اور عام فہم بھی ہے اور دلکش ودلچسپ بھی، ان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ آپ نے اپنی کتابوں میں قرآن وحدیث سے دلائل فراہم کرنے کے باوصف دیگر مذاہب کے فلسفیانہ اصطلاحوں کو بھی اسلامی عقائد کی تفہیم کا وسیلہ بنایا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ہندو مذہب کے ویدانت سے اچھی طرح واقف تھے اور سنسکرت زبان میں بھی کافی درک رکھتے تھے۔ ان کی گرانقدر تصنیف ''کلمۃ الحقائق'' کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے ماہر دکنیات ڈاکٹر محمد علی اثرؔ نے رقم کیا ہے:

''کلمۃ الحقائق میں تصوف وعرفان کے دقیق مسائل سیدھی سادی زبان اور عام فہم الفاظ میں بیان کئے گئے ہیں، مثلاً خدا کی ذات وصفات، ابتدا وانتہا، تقدیر وتدبیر، فنا وبقا اور دوسرے متصوفانہ مسائل پر سوال وجواب کی شکل میں روشنی ڈالی گئی ہے، برہان الدین جانمؒ نے اس میں جگہ جگہ آیات قرآنی اور احادیث بھی نقل کی ہیں اور مطالب کی تشریح کے سلسلہ میں مشہور صوفیا مولانا رومی اور ابوبکر شبلی کے اقوال بھی درج کئے ہیں اور کہیں کہیں سنسکرت اور ہندی الفاظ بھی استعمال کئے ہیں اور ہندو فلسفے کی اصطلاحوں کو اسلامی فلسفے سے ملانے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔''(۱۱)

''کلمۃ الحقائق'' کا ادبی امتیاز یہ ہے کہ دکنی ادب کے ماہرین وناقدین نے اسے دکنی نثر کا اولین ومستند رسالہ تسلیم کیا ہے کہ جس کا مصنف معروف اور کسی بھی شک وشبہ سے بالاتر ہے۔''(۱۲)

کلمۃ الحقائق کے علاوہ ان کے نثری رسائل حسب ذیل ہیں:

۱۔ مقصود ابتدائی۔ ۲۔ مجموعۃ الاشیاء۔ ۳۔ رسالۂ وجودیہ۔ ۴۔ ارشاد نامہ نثر، ان کی منظوم کتابوں میں: ۱۔ ارشاد نامہ منظوم۔ ۲۔ حجۃ البقاء۔ ۳۔ وصیۃ الہادی۔ ۴۔ سکھ سہیلا۔

۵۔پنج گنج۔ ۶۔عرفان از دیوان۔(۱۳)

منظومات سے چند شعر دیے جارہے ہیں تا کہ ان کی شاعری کا رنگ اور آہنگ معلوم ہو:

پہلے اس پر لیاو ایمان اللہ کرے سو ہوئے جان
قدیم القدیم آچھے وہ بعد از رچنا رچے وہ
قدیم جدید ہے اس تھے سب ایسا قدرت کیرا رب
سہج سہج سو اس کا ٹھار سہج ہوا ہے اس تھے یار

ارشاد نامہ شریعت کا فیض ہے اس میں رحمت کا
جس کو دے وے پاوے راہ کہیا یھدی من یشاء
شاہد ہے اوجا منظور جس کے نور سے کل معمور(۱۴)

شب روز تو ماری یاد میں تل تل نہ پل پل دم بدم
سچ بولتا گر جھوٹ اچھے کھاؤں ابد کئی ماس میں
جانمؔ کہے اے شہ پری، یک زہرا دسرا مشتری
توں سیام ہوں تیری چری، کہتا ہوں راسک راس میں

برہان الدین جانمؔ شریعت وطریقت کے مجمع البحرین تھے، ان کی بلند و بالا شخصیت سلسلۂ بندہ نواز کی ایسی مضبوط کڑی تھی جس کو نظر انداز کرنے کا تصور بھی ممکن نہیں ہے۔ ان کا وصال عین جوانی کے عالم میں ۱۰۰۷ھ مطابق ۱۵۹۸ء میں ہوا اور آپ کو اپنے والد میراں جی شمس العشاق کے مقبرے ہی میں سپرد خاک کیا گیا۔ راقم الحروف نے شاہ پور (بیجاپور) جاکر دونوں بزرگوں کی زیارت کی ہے۔ شاہ پور شہر بیجاپور کے مضافات کا قصبہ ہے جہاں اب چند پسماندہ مسلمان آباد ہیں۔ ''عزیز جان چشتیاں جانمؔ'' سے وفات کے سنہ ۱۰۰۷ھ کا استخراج کیا گیا ہے۔(۱۶)

حضرت سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ: سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ کا تخلص امینؔ اور شیرِ خدا لقب تھا، بعض اوقات اعلیٰؔ بھی بطور تخلص استعمال کیا ہے۔ سید شاہ برہان الدین جانمؔ کے فرزند اور سید شاہ میراں جی شمس العشاق کے پوتے تھے۔ سلسلۂ نسب سترہ واسطوں سے حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ تک پہنچتا

ہے۔اپنے والد کے انتقال کے چند ماہ بعد عالم ناسوت میں تشریف فرما ہوئے۔ولادت ۱۰۰۷ھ م ۱۵۹۸ء میں ہوئی،مادۂ تاریخ ہے ''پیر چشتیاں یو ہے''(۱۷) پروفیسر محمد علی اثرؔ نے سلطان سکندر عادل شاہ کے دور (۱۰۸۳ھ م ۱۶۷۲ء) کے شاعر اور شاہ امین الدین اعلیٰ کے مرید شاہ محمد حسین قادری معظمؔ بیجاپوری کی تصنیف مخطوطہ شجرۃ الاتقیاء (مخزونہ سالار جنگ میوزیم) کے حوالے سے تحریر کیا ہے۔

''حضرت جانم کو جب اس بات کی اطلاع ہوئی کہ آپ کی اہلیہ حاملہ ہیں تو انہوں نے اپنے خلفا و مریدین کو یہ خوشخبری سنائی اور ہونے والے بیٹے کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ ایک ساتھ غیب کے خزینے لے آئے گا،انہوں نے یہ بھی کہا کہ ایک بیابان میں دو شیر اور ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں،خدا نے ہمیں یاد کیا ہے اور ہم آپ سے رخصت ہونے والے ہیں''۔

سنے گھر میں امید ہے شاہ نے　　کئے لیچ شادی سو جم جاہ نے
اوسی روز شہہ نے دیے سب خبر　　صفت سب امیںؔ کی کہے کھول کر
خدا کا کہے شیر آتا ہے یو　　برابر چھپے گنج لاتا ہے یو
کہے اب طلب مجھ کیا ہے حضور　　اتا مجھ کوں جانا ہوا بالضرور
نہ یک ٹھار دو ملکے رہتے پلنگ　　نہ یک میان میں دو سمائے فرنگ
کہے سر اوپر ہے تمہارے خدا　　ہمیں اب تمہارے سوں ہوتے جدا(۱۸)

شاہ امین الدین اعلیٰ اپنے آبا و اجداد کی طرح حامل علم و عرفان اور صاحب کشف و کرامت بزرگ تھے،انھوں نے اپنے والد ماجد کی دعوت رشد و ہدایت اور تحریک تصوف و احسان کو جنوبی ہند کے دور دراز علاقوں تک پھیلا دیا۔بیسیوں خلفا اور سیکڑوں مریدان کے پیغام تعلق مع اللہ کو لے کر شہر شہر اور قریہ قریہ پہنچے،جہاں انہیں کفر و ضلالت کی تاریکیوں میں شمع ایمان و ایقان فروزاں کرنے کا زریں موقع فراہم ہوا۔نئے نئے مقامات اور نو بہ نو حالات میں ان نفوس قدسیہ نے مصائب و آلام کی پروا کئے بغیر سکون و طمانیت کے ساتھ اشاعت دین کا فریضہ انجام دیا۔یہی سبب ہے کہ آج بھی جنوبی ہند کے ہر قطعۂ زمین پر مسلمانوں کی آبادیاں باعزت و احترام بود و باش اختیار کی ہوئی ہیں۔

شاہ امین مادرزاد ولی تسلیم کئے جاتے ہیں،اکثر جذب و بے خودی کی کیفیت طاری رہتی تھی،

جب کبھی اس حال سے افاقہ ہوتا اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر گامزن رہتے ہوئے ارشاد وتلقین اور تصنیف وتالیف میں مشغول ہوجاتے، چنانچہ نظم ونثر میں تحریر کردہ متعدد کتابیں آج تک محفوظ ہیں، ان میں محبت نامہ، جواہرالاسرار، مدح برہان الدین جانم، سکھ سہیلا، قربیہ، حقیقت وجودیہ، غزلیں، گیت وغیرہ مختلف کتب خانوں کی زینت بڑھارہی ہیں۔ نثری تصنیفات میں گنج مخفی، وجودیہ، گفتار شاہ امین، ارشادات، ظاہر وباطن، عشق نامہ، شرح کلمۂ طیب، کلمۃ الاسرار قابل ذکر ہیں، (۱۹) چونکہ وہ صاحب تصرف وتکشف اور عارف حقیقت ومعرفت بزرگ تھے اسی لئے ان کی ذات بابرکت اسی دور میں عوام وخواص کی توجہات کا مرکز بنی ہوئی تھی اور ان کے تصرفات وکرامات کا چرچہ چاردانگ عالم میں خوب ہورہا تھا، اس صورت حال کی وجہ سے خواص میں سے بعض افراد معاندین وحاسدین بن گئے تھے جن میں حاکم وقت بھی شامل تھا، اس ضمن میں ایک واقعہ ''تاریخ بالکنڈہ'' کے مصنف نے رقم کیا ہے جس میں عبرت ونصیحت کے کئی پہلو ہیں۔

> ''حضرت امین الدین اعلیٰ بڑے پایہ کے بزرگ اور ولی تھے، آپ کے متعلق بعض کوتاہ اندیشوں نے نوجوان بادشاہِ وقت سلطان سکندر عادل شاہ (۱۶۷۳ء۔ ۱۶۸۶ء) کے خیالات کو برگشتہ کردیا، چنانچہ وہ ہر بات میں حضرت سے کج بحثی کرتا تھا اور حضرت کو نماز جمعہ کے لئے مسجد میں آنے کے لئے مجبور کرتا تھا، چنانچہ ایک روز خواجہ صاحب نے مسمیٰ قادر لنگا خادم (شاہ قلندر لنگا کوتالی) کو اپنا مصلیٰ دے کر تالاب شاہ پور لے گئے اور مرید (خادم) کو حکم دیا کہ پانی پر بچھادے، حکم کی تعمیل کی گئی، اس واقعہ کی شہرت تمام مخلوق میں ہوگئی اور بادشاہ خود بھی حاضر ہوا اور دیکھا کہ مصلیٰ تالاب کے عمیق حصے میں پانی پر بچھا ہوا ہے، حضرت نے ہر ایک سے فرمایا کہ ''چلو آؤ باجماعت نماز ادا کریں''، کسی کی ہمت نہ ہوئی تو خود حضرت ہی مصلیٰ پر کھڑے ہوکر دو رکعت نماز ادا فرما کر چلے آئے''۔ (۲۰)

ان کے حصولِ خلافت کا قصہ بھی بڑا عجیب وغریب ہے۔ مؤلف ''مشکوٰۃ النبوۃ'' نے شاہ امین الدین اعلیٰ کے حالات میں لکھا ہے:

> ''حضرت شاہ امین الدین اعلیٰ ہنوز در شکم مادر بود کہ شاہ برہان جانم روزے کلاہ

مبارک خود بر شکم مادر ایشاں نہادہ فرمودند کہ امین الدین در شکم تو است، ایں خرقۂ امانت اوست، باید کہ بدو رسانی پس حضرت ایشاں بوجود آمدہ بہ وقت خود بمعرفت خود آں کلاہ پدر بہ ہماں اجازت پدر پوشیدند''۔

یعنی شاہ امین الدین اعلیٰ ابھی ماں کے پیٹ ہی میں تھے کہ ایک روز برہان الدین جانمؒ نے اپنی کلاہ مبارک کو اپنی حاملہ بیوی کے پیٹ پر رکھ کر فرمایا کہ امینؒ الدین تمہارے شکم میں ہے، یہ خرقہ اس بچہ کی امانت ہے، چاہیے کہ اسے یہ امانت پہنچادی جائے، اس کے بعد آپ کی ولادت ہوئی اور سن شعور کو پہنچے تو آپ نے اس خرقۂ خلافت کو اپنے والد کی پیشگی اجازت کے سبب زیب تن کرلیا۔(۲۱)

علاوہ ازیں شاہ امین الدین کی تعلیم و تربیت کی تمام تر ذمہ داریاں شاہ جانمؒ نے اپنے خلیفۂ خاص شیخ محمود خوش دہان مصنف ''معرفت السلوک و رموز الانوار'' کے سپرد کردیں جنھوں نے سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی (۹۸۸ھ م ۱۵۸۰ء/ ۱۰۳۷ھ م ۱۶۲۷ھ) کی گرانقدر تصنیف ''نورس'' کی تعریف اپنی مثنوی ''علم الحیاۃ'' میں کی تھی، شاہ خوش دہاں سلسلۂ چشتیہ کے نامور بزرگ ہیں اور ان کا شمار اپنے وقت کے بلند پایہ علما اور کاملین صوفیہ میں ہوتا ہے۔ شاہ خوش دہاں نے اپنے شیخ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے شاہ امین الدین اعلیٰ کو علوم ظاہری اور رموز باطنی سے آراستہ و پیراستہ کیا اور پھر مرشد کی وصیت کے مطابق ان کی امانتِ خلافت کو اپنے شاگرد و مرید شاہ امین الدین کے حوالے کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کے بعد شجرۂ مرشد میں اپنا نام لے آئیں، یہ وجہ تھی کہ وہ اپنے والد شاہ جانمؒ کے خلیفہ و جانشین کہلائے۔ شاہ امین الدین سلسلۂ بندہ نواز کے اولیائے کبار میں اجتہادی فکر اور اختراعی مزاج کے حامل تھے، چنانچہ انھوں نے بدن انسان کی ترکیب وجودی کو ''چار عناصر'' کی بجائے پانچ عناصر کا مرہون منت بتایا ہے، بقول ڈاکٹر حسینی شاہد:

''حضرت امین کے نظامِ فکر میں چار عناصر آب، آتش، باد و خاک کے علاوہ ''خالی'' یا ''ہوا'' کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے، یہ حضرت امین کا اجتہاد ہے کہ وہ ان چاروں عناصر کی طرح خالی یا ہوا کو بھی ایک مستقل عنصر تسلیم کرتے ہیں، ان پانچوں عناصر کا انھوں نے اپنی تصانیف میں بالالتزام ذکر کیا ہے اور اس کے پچیس گن گنائے ہیں،

یہی وجہ ہے کہ ان کا تصوف ''پانچ عناصر پچیس گن'' کا تصوف کہلاتا ہے۔''(۲۲)

آخر میں شاہ امین کی غزلوں کے چند شعر دیے جارہے ہیں جن کا مطالعہ ان کے علمی وادبی مقام کے تعین کے لئے ناگزیر ہے۔

ارے من باولے مورکھا جھوں میں سیک سیانا ہو گنوایا عمر بے حاصل رہے کچ نا گنوانا ہو

شبے توں چھوڑ دے مادی کہوں یک بات سن تازی خدا جس باٹ ناراضی نہیں اس راہ جانا ہو

دوئی دل تھے یوسٹ دھوکر ہو نرمل پاک یک ہوکر ہو فانی یوں اپس کھوکر قدم ثابت نبھانا ہو

آنند بستا دل میں دائم غفلت سوں کی سوتے ہیں جس سوں یو دم آتا جاتا جان پوچ کی کھوتے ہیں

دل بحر میں غوّاص ہو روح صدف کے کاجیں امیں بے باہ درس صدف میں نور جاں تو سمجھیں امیں

دیکھو سکھی شہد کا لگن مجہ کو جلایا دل گیر کر دونین کے خنجر بنا نکلے کلیجہ چیر کر

گھائل پڑیا جا کدر تا روز محشر نا کہو چوٹیں لگائے ہیں مجے ہر ہر پلک کے تیر کر

شاہ امین اپنے فیوض و برکات کو دور دور تک بکھیرتے ہوئے بتاریخ ۲۴ر رمضان المبارک ۱۰۸۶ھ م ۱۶۷۵ء پردۂ خاک میں نہاں ہوگئے، ''ختم ولی'' سے سنہ وصال برآمد ہوتا ہے۔ ان کا مزار شاہ پور (بیجاپور) ہی میں اپنے والد وجد کے گنبد کے قریب زیارت گاہ خاص و عام بنا ہوا ہے۔

شاہ سلطان ثانیؒ: اسم گرامی سید غالب سلطان حسینی ہے مگر شہرت شاہ سلطان ثانی کے نام سے ہوئی، والد ماجد سید شاہ فخر سلطان حسینی چشتیؒ ملکِ روم کے کسی علاقے کے حکمران تھے، تین فرزندوں میں سید غالب حسین سب سے بڑے اور سید کلاں حسینی و سید اکبر حسینی بہت چھوٹے تھے۔ سید فخر سلطان اپنے اہل و عیال کے ساتھ عیش و عشرت کی زندگی گزارتے رہے کہ اچانک کسی سانحہ کی وجہ سے ان کا دل کاروبار سلطنت سے یکسر اچاٹ ہوگیا اور اک آگ سی سینے میں ایسی لگی کہ دنیا کی بے ثباتی ان پر روشن ہوگئی، دل میں جتنی بھی خواہشیں اور امیدیں تھیں جل کر خاکستر ہوگئیں، توفیق الٰہی کا وقت آ پہنچا تھا لہٰذا انھوں نے ترک دنیا کرتے ہوئے درویشی اختیار کرلی اور اپنے فرزند و جانشین غالب حسینی سے کہا کہ اب ہم اپنی تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوکر راہ خدا میں نکل رہے ہیں لہٰذا تخت و تاج تمہارے حوالے کرتے ہیں، آج سے تم ''سلطان ثانی'' ہو، یہ سن کر صاحبزادے نے عرض کیا حضور ابا جان! آپ جس چیز کو ٹھوکر ماردیں اسے میں اپنے سینے سے کیسے لگالوں، میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں، اسی

دن سے غالب حسینی کی عرفیت ''سلطان ثانی'' ہوگئی۔ بڑے بھائی کو والد کی معیت میں سفر پر نکلتے ہوئے دیکھ کر چھوٹے دو بھائی بھی ان کے ساتھ ہو لئے۔اس طرح یہ مختصر قافلہ وطن عزیز کو الوداع کہتے ہوئے سمندر کے راستے سے گجرات کی بندرگاہ پہنچا، پھر وہاں سے جنوبی ہند کی طرف چل پڑا، ان کی منزل کا پتہ خود انہیں معلوم نہ تھا، مگر تائید غیبی نے انہیں پہلے بیجاپور پھر گلبرگہ اور آخر میں بیدر پہنچا دیا، گجرات کی سرزمین سے بیدر (کرناٹک) کی سرخ زمین تک کا طویل ترین فاصلہ اس قافلہ نے کن کن مصیبتوں اور صعوبتوں کو جھیل کر طے کیا، کتنی مدت بعد انہیں اپنی منزل ملی اور کہاں کہاں ان کا قیام رہا، ان تمام تفصیلات کا علم رب تعالیٰ کے علاوہ کسی کو نہیں ہے۔

فخر سلطان پر چونکہ عشق الٰہی کا جذبہ طاری تھا اس لئے انہیں فوری کسی شیخ کامل کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ان دنوں بیدر علما و فضلا اور صوفیہ کا ملجا و ماویٰ تھا جہاں مختلف سلاسل کے شیوخ رہبری و رہنمائی کے لئے موجود تھے، اس کے باوجود ایک بارگاہ ایسی تھی جو اہل بصیرت کی نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی تھی اور تشنہ گانِ علم و حکمت کے حق میں علوم باطنی کا سرچشمہ کہلاتی تھی، اس درسگاہِ عشق و محبت کے معلم و مربی خانوادۂ حضرت بندہ نوازؒ کے چشم و چراغ عارف باللہ بزرگ خواجہ سید شاہ محمد اکبر حسینی چشتی خلیفہ خواجہ سید شاہ علی فتح حسینی حبیب اللہ چشتی علیہ الرحمہ تھے، فخر سلطان کے فیوض و برکات کا چرچہ سن کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور اپنا مدعیٰ بیان کیا، چشم بصیرت نے دیکھ لیا کہ فخر سلطان میں طلب صادق موجزن ہے اس لئے خواجہ اکبر حسینی نے انہیں نہ صرف سلسلۂ چشتیہ میں بیعت سے سرفراز کیا بلکہ تکمیل سلوک اور تعلیم معارف کے بعد خلافت و اجازت سے بہرہ ور فرمایا (۲۴) شاہ فخر سلطان نے اپنے مرشد کی صحبت میں ایک عرصہ گذار کر ان کے حکم اور اشارۂ غیبی کے تحت ٹمل ناڈو کے قصبۂ ورگرم پونڈی (Vargrampondi) چلے آئے۔ یہ قصبہ ترچی (Tirchy) سے پچاس کلو میٹر فاصلہ پر چنائی۔ ترچی شاہ راہ پر واقع توڑ دور (Thozudur) نامی قریے سے آٹھ کلو میٹر دور مغرب کی سمت آباد ہے۔ شاہ فخر سلطان نے ''ورگرم پونڈی'' میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ مستقل قیام فرمایا اور یہیں اپنے فرزند کلاں شاہ سلطان ثانی کو خرقۂ خلافت پہنا کر منصب ہدایت و ارشاد پر متمکن فرمایا، جب ان کے وصال کا وقت قریب ہوا تو شاہ سلطان ثانی کو ایک مقام پر لے گئے اور اپنے عصا سے وہاں لمبی لکیر کھینچتے ہوئے فرمایا جب میں وفات پا جاؤں تو بعد نماز و دعا تم میرا جنازہ اس لکیر پر رکھ دینا، زمین خود

بخود شق ہوجائے گی اور میرا جسد خاکی اس میں سما جائے گا، بعد کو وہاں پر تربت بنا دینا، شاہ سلطان نے والد کے حکم کے مطابق عمل کیا اور وہیں پر مرقد بنا دیا، شاہ سلطان ثانی کے خاندان کے ایک فرد موجودہ سجادہ سید شاہ مقبول حسینی چشتی عرف مشرف شاہ کی روایت ہے کہ ایک شب تنجاور (ٹمل ناڈو) کے راجہ کو بشارت ہوئی جس میں شاہ فخر سلطان نے راجہ سے کہا کہ وہ انہیں ''ورگرم پونڈی'' سے دوسرے مقام پر منتقل کریں کیونکہ وہ یہ دربار اپنے فرزند کو عطا کررہے ہیں۔خواب بار بار دیکھنے کے بعد راجہ پریشان ہوکر ''ورگرم پونڈی'' حاضر ہوا اور اس وقت کے سجادوں سے مشورہ کرنے کے بعد ان کی نعش کو بصد احترام ''ایم پٹی'' (ضلع تنجاور) میں سپرد خاک کیا، آج ایم پٹی میں آپ کا مزار اندرونِ ''درویش مکان'' مشتاقوں کی زیارت گاہ بنا ہوا ہے۔شاہ فخر سلطان کے جسد مبارک کے ساتھ ان کے دونوں صاحبزادے اور ان کی اہلیہ محترمہ جو اس وقت تک حیات تھیں، ورگرم پونڈی سے روانہ ہوگئیں۔

راقم الحروف شاہ سلطان ثانی کے مزار کی تلاش میں اپنے دوست واحباب جناب سید سلیم ویلوری بن سید جانی باشاہ مرحوم، مولانا حافظ اے گلزار احمد باقوی آمبوری اور مولانا حافظ محمد حسین باقوی چنتا گنٹہ کے ہمراہ ''ورگرم پونڈی'' پہنچا اور درگاہ میں حاضر ہوکر بزرگوں کی زیارت سے مشرف ہوا۔ وہاں ایک قدیم قبرستان ہے جس میں داخل ہونے سے پیشتر چار دیواری کا احاطہ ملتا ہے، اس احاطہ میں چند پختہ قبریں ہیں جن پر کوئی گنبد نہیں ہے، ان مزاروں میں داخلہ دروازے کے روبرو سب سے اونچا شاہ سلطان ثانی کا مزار ہے، اس کی بائیں طرف شاہ فخر سلطان کا مزار ایک چھوٹے چبوترے پر بنایا گیا ہے جو حسبِ روایت خالی بتایا جاتا ہے، شاہ سلطان ثانی کے دائیں طرف کی دو تربتیں اور پائیں جانب کے چہار مرقد شاہ سلطان کے چھ صاحبزادوں کے ہیں، اس کے نیچے علاحدہ ان کی دختر فاطمہ کی آرام گاہ ہے، شاہ سلطان ثانی کے ساتویں اور آخری فرزند سید شاہ سلطان قدس سرہ (متوفی ۱۱۹۴ھ م ۱۷۸۰ء) کا مزار شہر ویلور (ٹمل ناڈو) کی مشہور سڑک گاندھی روڈ کی مسجد علی سلطان درگاہ کے اندرونی حصہ میں اندرونِ گنبد ہے۔شاہ علی سلطان ایک خدارسیدہ مجذوب بزرگ اور باکرامت ولی تھے۔ان کا ایک تاریخی واقعہ مصنف ''بہارِ اعظم جاہی'' نے تفصیل کے ساتھ رقم کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ سلطنت خداداد کے بانی نواب حیدر علی (متوفی ۱۱۹۵ھ م ۱۷۸۲ء) کے دور حکومت میں جبکہ ویلور کا قلعہ بتاریخ ۱۶/رجب المرجب ۱۱۹۴ھ فتح ہوا تھا، ایک اجنبی شخص فوجیوں کے خیموں کے درمیان گھومتا

ہوا دکھائی دیا اس وقت اتفاقاً نواب حیدر علی فوجیوں کا معائنہ کر رہے تھے، ان کی نظر اس اجنبی پر پڑی تو چراغ پا ہوگئے اور اسے جاسوس سمجھ کر حوالات میں بند کروا دیا، مگر تھوڑی ہی دیر میں وہ پھر خیموں کے پاس نظر آیا، یہ دیکھ کر حیدر علی نے غصہ کے عالم میں اس شخص کو قتل کرنے کا حکم صادر کیا، پھر دوسرے دن حیدر علی حسب عادت لشکر گاہ میں معائنہ کے لئے آئے تو وہاں اسی اجنبی کو موجود پا کر غضبناک ہوگئے اور اسے اپنے روبرو تہہ تیغ کروا دیا، جب تیسرے دن نواب موصوف کی تشریف آوری معسکر میں ہوئی تو یہ دیکھ کر ان کے ہوش اڑ گئے کہ وہ صاحب وہیں پر کھڑے ہیں۔ اب نواب صاحب کی عقل ٹھکانے لگی اور انہیں یقین ہوا کہ یہ کوئی عام آدمی نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے خاص بندے اور اس کے ولی ہیں جو سلطنت خداداد کی فوج کے تحفظ کے لئے منجانب اللہ مامور ہیں۔ نواب حیدر علی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو بڑی شرمندگی کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بے حد عاجزی اور انکسار سے معافی مانگی، یہی بزرگ سید شاہ علی سلطان بن سید شاہ سلطان ثانی تھے، حیدر علی نے آپ کی خدمت میں ہدایا و تحائف نذر کئے، انھوں نے سبھی چیزیں لوٹا دیں اور حیدر علی کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ غصہ کا شکار ہو کر غلط فیصلے نہ کرے اور آئندہ احتیاط برتے۔ بعد ازاں نواب صاحب نے ان کے قیام کے لئے وسیع قطعۂ زمین مختص کر دیا جہاں ان کا مزار زیارت گاہ بنا ہوا ہے۔ سید شاہ علی سلطانؒ اس واقعہ کے چند دن بعد تقریباً ۹۹ سال کی عمر میں ۲؍ شعبان ۱۱۹۴ھ کو اس دارِ فانی سے رحلت فرما گئے۔ (۲۵)

الغرض شاہ سلطان ثانی اپنے والد کی وصیت و ہدایت کے مطابق تبلیغ اسلام کے مقدس فریضہ کو انجام دینے میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ انھوں نے عوام کی فلاح و خواص کی اصلاح کی خاطر جنوبی ہند کے دور دراز علاقوں کا سفر کیا اور لوگوں کے ذہنوں میں جاگزیں باطل عقیدوں اور وہاں پھیلی ہوئی غلط کاریوں کو اپنے شیریں کلام و عمدہ نصائح کے ذریعہ مٹا دیا، یہ امر مسلم ہے کہ آپ کے وطن ثانی ''ورگرم پونڈی'' کے اطراف و اکناف ہی میں نہیں بلکہ ٹمل ناڈو کے دیگر تمام علاقوں میں بھی عام طور پر بولی اور سمجھی جانے والی زبان ''ٹمل'' ہے اور یہ ٹمل زبان آج بھی مسلمانوں اور غیر مسلمان کے درمیان مشترکہ زبان ہے اور یہاں کے باشندوں کی مادری زبان بھی ہے، اردو بولنے والی آبادیاں یہاں کم کم ہیں۔ یہ آج کا منظر نامہ ہے تو تین سو سال پہلے یہاں کی صورت حال کیا رہی ہوگی اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے، اس زمینی حقیقت کے مدنظر ہمارا یہ قیاس صحیح ہونا چاہیے کہ شاہ سلطان ثانی نے ٹمل ناڈو

میں ایمان واحسان کا پیغام پہنچانے کے لئے مقامی زبان ہی کو وسیلۂ اظہار بنایا، اس قیاس سے یہ منطقی نتیجہ نکلتا ہے کہ انھوں نے ٹمل ناڈو میں قیام کے دوران ٹمل زبان سیکھ لی تھی جیسا کہ ان کی مادری زبان فارسی ہونے کے باوجود انھوں نے بیجاپور اور گلبرگہ میں رہتے ہوئے دکنی سیکھی تھی اور اس میں تصنیف وتالیف بھی کی تھی اس بات کا اندازہ ان کے شعری دیوان اور نثری کتابوں سے بآسانی لگایا جاسکتا ہے اور یہ بھی قرین قیاس ہے کہ اشاعت دین وتبلیغ اسلام کے مختلف مراحل میں یہاں کے مذہبی پیشواؤں، اعلیٰ ذات کے پنڈتوں اور برہمن پجاریوں سے گفتگو، بحث وتکرار اور مقابلہ آرائی کی نوبت آئی ہوگی تو ان سے سنسکرت زبان کے حوالے سے مکالمہ ہوا ہوگا۔ یہ کوئی انہونی بات بھی نہیں ہے، کیونکہ مصلحان قوم اور داعیان دین کے لئے مختلف زبانوں میں درک رکھنے کا عمل مشکل نہیں ہے بلکہ بسااوقات اپنے مخاطب ومدعو کی تفہیم وتعلیم کے لئے ناگزیر بھی ہے۔ اس کی مثال خود بندہ نواز کی ذات گرامی ہے، یہ اس لئے کہ آپ نے اپنی مادری زبان فارسی ہونے کے باوجود گلبرگہ تشریف لانے کے بعد مقامی زبان دکنی سیکھی تھی اور دکھنی زبان ہی میں آپ عوام الناس سے مخاطب ہوتے تھے اور یہ بھی ممکن ہے کہ شاہ سلطان ثانی نے دکنی زبان کی طرح ٹمل زبان میں بھی تصوف واحسان کے موضوع پر چند رسائل قلم بند کئے ہوں اس پر اہل علم واصحاب نقد کو توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

شاہ سلطان ثانی نے اپنے قیام بیجاپور، گلبرگہ اور بیدر کے زمانے میں قدیم اردو یعنی دکنی میں بیش بہا کتابیں تصنیف کیں اور ساڑھے تین ہزار اشعار پر مشتمل ضخیم دیوان مرتب کیا جس میں ۴۷۸ غزلیں ہیں، اس دیوان کے بارہ نسخوں کا ذکر ڈاکٹر محمد علی اثر نے کیا ہے جو حیدرآباد، علی گڑھ اور پاکستان کے مختلف کتب خانوں کی زینت بڑھا رہے ہیں۔ (۲۶)

نثری تصنیفات میں درالاسرار اور رزنجیرہ علمی وادبی حلقوں کی توجہ کا مرکز بنیں، جن میں طریقت کے معارف وحقائق کی تفہیم بڑی عمدگی وشائستگی سے کی گئی ہے علاوہ ازیں تصوف کے دقیق مسائل کو قرآنی آیتوں، حدیثوں اور مثالوں کے ذریعہ انتہائی سہل اسلوب میں سمجھایا گیا ہے۔ بعض اہل علم نے درالاسرار کو خواجہ بندہ نوازؒ سے منسوب کیا تھا مگر اس کی تردید کرتے ہوئے پروفیسر م، ن، سعید نے اپنی مؤقر تصنیف ''خواجہ بندہ نواز سے منسوب رسائل'' میں دُرالاسرار کا مفصل تجزیہ پیش کرکے اس کا ازالہ کردیا۔ (۲۷) علاوہ ازیں ڈاکٹر رضیہ صدیقی نے جامعہ عثمانیہ سے ''دیوان سلطان

کی تنقیدی تدوین'' کے عنوان کے تحت تحقیقی مقالہ پیش کر کے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی تھی۔ جس میں ڈاکٹر صاحبہ نے یہ اطلاع دی کہ شاہ سلطان ثانی کا انتقال ۷۹ رسال کی عمر میں ۱۰ ررمضان المبارک (۱۰۹۷ھ/ ۱۶۸۵ء) کو ہوا اور مزار ''وڑی گرہ پونڈی'' میں ہے۔ (۲۸) راقم نے چونکہ مزار شاہ سلطان کی زیارت کی، اس لئے یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ اس قصبہ کا نام جہاں مزار ہے ''وڑی گرہ پونڈی'' نہیں بلکہ ''ورگرم پونڈی'' ہے جس کے محل وقوع کی تفصیل سطور بالا میں گزر چکی ہے۔

شاہ سلطان کے خلفا و مریدین سیکڑوں تھے جن میں دو بھائی، داماد سید احمد عرف جعفر صاحب، صاحب دیوان دکنی شاعر شاہ عالم شغلیؔ (متوفی ۱۱۱۴ھ، مادۂ تاریخ ''غاب قطب'') اور خادم خاص شاہ مرتضیٰ گیانی مشہور ہیں۔ شجرۂ طریقت اس طرح ہے:

حضرت خواجہ شاہ سلطان ثانی حسینی چشتی

حضرت خواجہ شاہ سید فخر شاہ سلطان حسینی چشتی

حضرت خواجہ شاہ اکبر حسینی چشتی

حضرت خواجہ سید علی فتح حسینی حبیب اللہ چشتی

حضرت خواجہ شاہ کلاں حسینی چشتی

حضرت خواجہ شاہ ابوالحسن حسینی چشتی

حضرت خواجہ شاہ سید محمد حسینی چشتی

حضرت خواجہ شاہ سید قطب الدین ثانی امین الدین حسینی چشتی

حضرت خواجہ شاہ کلیم اللہ حسینی چشتی

حضرت خواجہ شاہ علی حسینی چشتی

حضرت خواجہ شاہ ابوالحسن حسینی چشتی

حضرت خواجہ شاہ سید من اللہ حسینی چشتی

حضرت خواجہ شاہ سید یداللہ حسینی چشتی

حضرت خواجہ سید محمد حسینی بندہ نواز گیسودراز قدس سرہ

چند شعر نموتاً نذر قارئین کئے جارہے ہیں تا کہ ان کے علمی مرتبہ کے ساتھ ادبی مقام کا بھی اندازہ ہوجائے۔

ہمن بے رنگ رنداں کوں بڑیاں عزتاں کیا کام
ہمن مفلس گدایاں کوں قماشی کسوتاں کیا کام

تجہ اس سلونے نین پر تجہ ابروئے قوسین پر
ہور مٹھ رسیلی نین پر بلہار ہوں بلہار ہوں

تج حسن کے گلزار پر، تجھ زلف کے اس مار پر
ہور نیاز کے عیار پر بلہار ہوں بلہار ہوں

مکھڑا ترا یو دیکھ پری سار آفتاب
ہر صبح آ کھڑا ترے دربار آفتاب

ہر روز تجھ کوں دیکھو اے سلطانِ حسن سن
پھرتا ہے تجھ او پر نے اپس وار آفتاب (۳۰)

من عرف کے ہر حکم سچھ ہے معرفت خود میں سکل
اب تے جدا کر پوچھنا سو او درایت ہے غلط

اپنی خودی کھوئے بجز سلطان ملتا ہے کٹھن
جز از فنا لیکر سخن اندر ولایت ہے غلط

سنگار کر اپ گھر سیتی نکلیا ہے خوباں یک طرف
ہر ڈگ میں ٹھمکی اک طرف کر چک کے نازاں یک طرف
او تیرے میرے تن منے ٹکڑا ہوا یوں جا بجا
سوفار اوس کا یک طرف ہو چوب پیکاں یک طرف (۳۱)

الحاصل شاہ سلطان ثانی کی شخصیت داعیانہ اور شاعرانہ ہر اعتبار سے قابل توجہ والتفات ہی نہیں بلکہ قابل احترام واتباع بھی ہے، ان کا علمی وادبی مرتبہ بہت بلند ہے جس کا اقرار ہمارے محققین و ناقدین کو کھلے اور صاف دل سے کرنا چاہیے۔ یہ چند نمونے سلسلۂ بندہ نواز کے اولیائے کرام کی علمی و ادبی خدمات کے تحت پیش کئے گئے ہیں تا کہ آئندہ اس موضوع پر مزید تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے رہنمائی ہوسکے۔

مآخذ

(۱) خواجہ دکن، مشمولہ ''ایوان اردو'' دہلی، مارچ ۲۰۰۴ء ص ۷ ماخوذ از ''بصارت سے بصیرت تک''، ڈاکٹر محمد علی اثر مطبوعہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۱۲ء، ص ۱۲۔ (۲) ڈاکٹر راہی فدائی ''استشہاد'' کرناٹک اردو

اکادمی ، بنگلور مطبوعہ ۲۰۱۲ء ص ۷۰-۷۱۔(۳) میراں جی شمس العشاق، خودنوشت، مخطوطہ(۸۶۳)، ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد، ص ۲۱۔(۴) شجرۃ الاتقیاء، مخطوطہ ۱۳۱، تصوف، کتب خانۂ سالار جنگ، حیدرآباد بحوالہ ''تحقیقات اثر''، از ڈاکٹر محمد علی اثرؔ، نشاط پبلیشرز، محبوب چوک، حیدرآباد، مطبوعہ ۲۰۰۵ء، ص ۲۴۔(۵) ڈاکٹر محمد جمال شریف ''دکنی میں اردو شاعری ولی سے پہلے'' ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد، ۲۰۰۴ء، ص ۱۴۳۔(۶) کلمۃ الحقائق ص: ۵، بحوالہ ''دکن میں اردو شاعری ولی سے پہلے'' از ڈاکٹر محمد جمال شریف، نظر ثانی و مقدمہ، ڈاکٹر محمد علی اثرؔ ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد، مطبوعہ ۲۰۰۴ء، ص ۱۴۹۔(۷) ڈاکٹر محمد جمال شریف، ''دکن میں اردو شاعری ولی سے پہلے'' ص: ۱۵۰-۱۵۱۔(۸) ایضاً، ص ۱۷۴۔(۹) ایضاً، ص ۱۷۶۔(۱۰) ڈاکٹر محمد علی اثر، تحقیقاتِ اثر مطبوعہ، ۲۰۰۵ء، ص ۲۶۔(۱۱) ڈاکٹر محمد علی اثرؔ، ''بصارت سے بصیرت تک'' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی مطبوعہ ۲۰۱۲ء، ص: ۴۵-۴۶۔(۱۲) ایضاً، ص ۴۴۔ (۱۳) پروفیسر محمد علی اثرؔ ''عادل شاہی دور میں اردو غزل''، کرناٹک اردو اکادمی ، بنگلور، مطبوعہ ۲۰۱۳ء، ص ۵۹۔(۱۴) تحقیقات اثر، ص ۳۴-۳۶۔(۱۵) ''عادل شاہی دور میں اردو غزل''، ص ۱۶۳۔(۱۶) ''دکنی میں اردو شاعری ولی سے پہلے'' حاشیہ ڈاکٹر محمد علی اثرؔ، ص ۱۷۷۔(۱۷) ایضاً، ص ۱۷۷۔(۱۸) تحقیقات اثر، ص ۲۶۔(۱۹) ''عادل شاہی دور میں اردو غزل''، ص ۱۹۴۔(۲۰) ''دکن میں اردو شاعری ولی سے پہلے''، ص ۱۰۴۔(۲۱) ایضاً، ص ۳۹۸۔(۲۲) ڈاکٹر حسینی شاہد، ''سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ......حیات و کارنامے'' انجمن ترقی اردو ، حیدرآباد، مطبوعہ ۱۹۷۳ء ، ص ۱۶۲۔(۲۳) ''عادل شاہی دور میں اردو غزل''، ص ۱۹۶، ۱۹۸، ۲۰۰، ۲۰۱۔(۲۴) ڈاکٹر رضیہ سلطانہ ''دیوان سلطان کی تنقیدی تدوین'' غیر مطبوعہ بحوالہ ''عادل شاہی دور میں اردو غزل''، ص ۱۶۳۔(۲۵) مولانا غلام عبدالقادر ناظر مدراسی ''بہارِ اعظم جاہی'' مدینۃ الیکٹرک لیتھو پریس ، مدراس، مطبوعہ ۱۹۶۱ء، ص ۱۸۶۔(۲۶) ''عادل شاہی دور میں اردو غزل''، ص ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۴۔(۲۷) پروفیسر م ن سعید ''خواجہ بندہ نوازؒ سے منسوب دکنی رسائل''، ایچ ایس آفسیٹ پرنٹرس، دہلی، مطبوعہ ۲۰۱۳ء، ص ۲۱۰ تا ۲۲۵۔(۲۸) ''عادل شاہی دور میں اردو غزل''، ص ۱۶۴۔(۲۹) ''خواجہ بندہ نواز سے منسوب دکنی رسائل''، ص ۲۳۵، ۲۳۶۔(۳۰) ''عادل شاہی دور میں اردو غزل''، ص: ۱۶۶، ۱۶۷۔ (۳۱) ''دکن میں اردو شاعری ولی سے پہلے''، ص ۲۹۷، ۲۹۸۔

علامہ اقبال کا ایک اہم غیر مطبوعہ خط

اور ایک نادر مکتوب کا غیر شائع شدہ عکس

☆ جناب ذاکر حسین

علامہ اقبال کی کلیاتِ مکتوباتِ اقبال جو کہ ۱۴۰۰ سے زیادہ خطوط پر مشتمل ہے اور جس میں ۲۸ غیر مطبوعہ خطوط بھی شامل ہیں جس میں اب بھی اور کچھ نئے دریافت شدہ خطوط شامل نہیں ہیں۔ مثلاً میرا نو دریافت کردہ اقبال کا مکتوب اور آل احمد سرور کے نام اقبال کے خط کی عکسی کاپی جو کہ اب تک کہیں شائع نہیں ہوئی ہے، بہت اہم ہیں۔ اسی طرح معارف میں حالیہ شائع شدہ دو غیر مطبوعہ خطوط وغیرہ وغیرہ۔

ڈاکٹر سر سید راس مسعود (۱۸۸۹ء تا ۱۹۳۷ء) اقبال کے نہایت قریبی دوستوں میں شامل تھے۔ وہ اقبال اور مولانا سید سلیمان ندوی کے ساتھ اس اعلیٰ تعلیمی وفد میں شامل تھے جس نے حکومت افغانستان کی دعوت پر اکتوبر ۱۹۳۳ء میں کابل کا دورہ کیا تھا، اقبال، سر سید مسعود کے ساتھ ۲۳/ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو افغانستان پہنچ گئے تھے، جہاں ۲۶/ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو سید سلیمان ندوی بھی ان سے آ کر مل گئے تھے۔ علامہ اقبال اور سر راس مسعود ۲/ نومبر ۱۹۳۳ء کو وہاں سے کوئٹہ کے راستے کابل سے ۴/ نومبر ۱۹۳۳ء کو واپس لاہور آئے۔ اقبال کو ۳۱/ اکتوبر ۱۹۳۳ء بروز اتوار بخار آ گیا تھا جس کی وجہ سے ایک ہفتہ سے زیادہ کمزوری رہی اور غالباً ۸/ نومبر ۱۹۳۳ء کو اقبال نے یہ نو دریافت خط سر راس مسعود کو انگریزی میں لکھا تھا جو کہ آل احمد سرور کلکشن ۲۰۱۱ء میں علی گڑھ سے حاصل کیا گیا تھا جسے سرور صاحب کی اہلیہ نے دیا تھا۔ اس میں ۲۸۰۰ خطوط شامل تھے جن میں سر راس مسعود اور آل احمد سرور کے نام دو خطوط بھی شامل ہیں۔

☆ سابق اسسٹینٹ ڈائریکٹر، نیشنل آرکائیوز آف انڈیا، جن پتھ، نئی دہلی۔

یہ کہنا کہ پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کا انگریزی میں دریافت کردہ وہ خط ۱۴/ دسمبر ۱۹۳۳ء کو لکھا گیا، سر راس مسعود کے نام لکھا گیا پہلا خط (۱) ہے جو کہ ۱۹۸۹ میں شائع ہوا ہے غلط ہے کیونکہ اس سے پہلے ہی شاعر ۱۹۸۸ء کے اقبال نمبر میں (۲) آخر ستمبر (۳) اور ۹/ اور ۱۰/ اکتوبر ۱۹۳۳ء کے اقبال نمبر میں اقبال کے تین اولین خطوط شائع ہو چکے ہیں۔ (۴) اس طرح اقبال کا ۲۵واں، ۲۶واں اور ۲۷واں خط یہی تین خطوط ہیں جو کہ آخر ستمبر ۹/ اکتوبر اور ۱۰/ اکتوبر ۱۹۳۳ء ہیں اس کے بعد رفیع الدین ہاشمی کے خطوط اقبال میں بھی ایک نیا خط سر راس مسعود کے نام کا ہے۔ اس کے علاوہ ۲۴ خطوط میں سے ۶/ انگریزی خطوط کے متن بشیر احمد ڈار نے شائع کر دیے ہیں (۵) مگر اس سلسلہ کا آخری نو دریافت شدہ خط ۸/ نومبر ۱۹۳۳ء کا ہے (۶) جو کہ اس سلسلے میں بارہواں انگریزی مکتوب ہے۔ اس طرح کل ملا کر سر راس مسعود کے نام اقبال کے ۳۰/ خطوط ہیں۔

آل احمد سرور کو غالباً یہ خط انجمن ترقی اردو (ہند) سے ملا، کیونکہ ۱۹۲۴ء سے سر راس مسعود کا تعلق انجمن ترقی اردو سے رہا ہے، ممکن ہے کہ یہ خط ان کو سر راس مسعود کے کاغذات سے دستیاب ہوا ہو، یہ خط بہت ہی اہم ہے اور اس میں اقبال کے اپنے ایک دو نظریات اور خیالات کا عکس نظر آتا ہے کیونکہ انھوں نے اپنے بعض خیالات کا اظہار سر راس مسعود سے کر دیا ہے۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال

ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی، بیرسٹرایٹ لا،

لاہور

Dr. Sir Mohd Iqbal, KT

MA Ph.d, Barrister at Law

Lahore

[Post 8th November 1933]

My Dear Masood,

Thank you very much for your letter which I received a moment ago. I am so sorry to learn that you are still unwell. I hope that you will be alright soon. I had too had my share of malaria which kept me down to for more than a week. It was very good of you to remember the talk we had during

our journey to Kabul. As you know or can easily imagine, I am temperamentally unfit to deal with matters like this. Now is it my nature to entertain interpretations to the brood over them. This is the degree or perhaps belssing of the philosophical turn of mind. The truth is that so far I can get nothing to communicate to you. Now I can say is that the matter rests with the viceroy more or less. If anything turns up I shall accordingly write to you.

Ali Bakhsh my servent is constantly talking of Sums that you had the charm of attraction and..................

Yours Sincerely
Mohammad Iqbal

ڈاکٹر سر محمد اقبال

ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی، بیرسٹر ایٹ لا،

لاہور

مائی ڈیر مسعود۔

آپ کے خط کے لئے بہت شکریہ جو مجھے ایک لمحہ پہلے ملا ہے۔ مجھے یہ جان کر انتہائی افسوس ہوا کہ آپ ابھی تک علیل ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ جلد ہی شفایاب ہوجائیں گے، مجھے بھی ملیریا بخار ہوا تھا جس نے مجھے ایک ہفتہ سے زیادہ جکڑے رکھا۔ یہ آپ کے لئے خوشی کی بات ہے کہ آپ نے وہ گفتگو یاد رکھی جو کہ ہمارے درمیان سفر کابل کے دوران ہوئی تھی۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں اور بآسانی تصور کر سکتے ہیں کہ میں فطرتاً اس قسم کے معاملات سے تعلق نہیں رکھ سکتا۔ اب یہ میری فطرت ہے کہ ان کے بارے میں معلوم کرکے ان کی تشریح کر سکتا ہوں۔ یہ انتہائی درجہ میرے دماغ کا یا فلسفیانہ رجحان کا عطیہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں ابھی تک کوئی بات کہنے سے قاصر ہوں۔ اب میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ معاملہ کم وبیش وایسرائے کے پاس ہے۔ اگر کچھ ہوتا ہے تو میں آپ کو اس کے بارے میں لکھوں گا۔

علی بخش میرا خادم مسلسل اس رقم کے بارے میں کہہ رہا ہے جس کے ذریعہ آپ نے اسے متاثر کیا ہے۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

اقبال کے اس خط کو پڑھتے وقت یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ ۳؍ستمبر ۱۹۳۳ء کو نادر شاہ افغانستان نے تعلیمی مشورے کے لئے علامہ اقبال، سر راس مسعود اور مولانا سید سلیمان ندوی کو افغانستان آنے کی دعوت دی تھی۔ قونصل جنرل کی خواہش تھی کہ تینوں ۱۳؍اکتوبر ۱۹۳۳ء میں جشن استقلال کے موقع پر کابل پہنچیں مگر کچھ وقت پاسپورٹ بننے میں لگا۔ ۱۶؍اکتوبر ۱۹۳۳ء کو اقبال اور سر راس مسعود کے پاسپورٹ مل گئے۔ ان دونوں نے ۲۰؍اکتوبر ۱۹۳۳ء کو لاہور سے پشاور روانگی کا پروگرام بنایا۔ اقبال اور سر راس مسعود ۲۳؍اکتوبر ۱۹۳۳ء کو کابل پہنچے ۲۶؍اکتوبر ۱۹۳۳ء کو سید سلیمان ندوی ان دونوں سے آن ملے۔ ۲؍نومبر ۱۹۳۳ء کو کابل سے واپس آنے کے لئے روانہ ہوئے اور ۳؍نومبر ۱۹۳۳ء کو کوئٹہ سے لاہور کے لئے سوار ہوئے اور ۴؍نومبر ۱۹۳۳ء کو لاہور پہنچے۔

اس طرح آل احمد سرور کلکشن میں علامہ اقبال کا سرور کے نام اصل خط بھی موجود ہے جس کا صرف متن ہی ''ماہ نو'' لاہور/کراچی میں ۱۹۷۷ء میں اقبال نمبر میں آل احمد سرور نے شائع کرایا ہے۔ اصل خط کی فوٹو کاپی آج تک نہیں چھپی ہے۔ اس کا اولین متن عطاء اللہ کے ''اقبال نامہ'' میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں پہلی مرتبہ اس اصل خط کی فوٹو کاپی شائع ہو رہی ہے اس کی فوٹو آل احمد سرور بھی غالباً مصلحتاً نہ چھپوا سکے تھے۔ سب سے پہلے تو اس کا متن درج ذیل ہے جس سے اس مکتوب کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے حتیٰ کہ کلیات مکاتیب اقبال میں بھی اس کا عکس نہیں ہے۔

لاہور ۱۳؍مارچ ۱۹۳۷ء

جناب من!

میری آنکھوں میں پانی اترنے کے آثار ہیں۔ ڈاکٹر لکھنے پڑھنے سے منع کرتے ہیں۔ جب تک کہ آپریشن نہ ہو جائے۔ معاف کیجئے گا کہ میں یہ خط اپنے ایک دوست سے لکھوا رہا ہوں۔

آپ کے دل میں کچھ باتیں پیدا ہوئی ہیں۔ ان کا جواب بہت طویل ہے اور میں بحالت موجودہ طویل خط لکھنے سے قاصر ہوں، اگر میں کبھی علی گڑھ حاضر ہوا۔ یا آپ کبھی لاہور تشریف لائے تو انشاءاللہ زبانی گفتگو ہوگی سر دست دو چار باتیں عرض کرتا ہوں:

۱۔ میرے نزدیک نازم کمیونزم یا زمانۂ حال کے اور ازم کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ میرے عقیدے کے رو سے صرف اسلام ہی ایک حقیقت ہے جو بنی نوع انسان کے لیے ہر نقطۂ نگاہ سے

موجب نجات ہوسکتی (ہے)۔

۲۔ میرے کلام پر ناقدانہ نظر ڈالنے سے پہلے حقائق اسلامیہ کا مطالعہ ضروری ہے اگر آپ پورے غور اور توجہ سے یہ مطالعہ کریں تو یہ ممکن ہے کہ آپ انہی نتائج تک پہنچیں جن تک میں پہنچا ہوں۔ اس صورت میں غالباً آپ کے شکوک تمام کے تمام رفع ہوجائیں۔ یہ ممکن ہے کہ آپ کا عقیدہ مجھ سے مختلف ہو یا آپ خود دین اسلام کے حقائق کو ہی ناقص تصور کریں۔ اس دوسری صورت میں دوستانہ بحث ہوسکتی ہے جس کا نتیجہ معلوم نہیں کیا ہو۔

۳۔ آپ کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے میرے کلام کا بھی بالاستیعاب مطالعہ نہیں کیا۔ اگر میرا یہ خیال صحیح ہے تو میں آپ کو یہ دوستانہ مشورہ دیتا ہوں کہ آپ اس طرف بھی توجہ دیں۔ کیوں کہ ایسا کرنے سے بہت سی باتیں خود بخود آپ کی سمجھ میں آجائیں گی۔

مسولینی کے متعلق جو کچھ میں نے لکھا ہے اس میں آپ کو تناقص نظر آتا ہے۔ آپ درست فرماتے ہیں لیکن اگر اس بندہ خدا میں Devil اور Saint دونوں کی خصوصیات جمع ہوں۔ تو اس کا میں کیا علاج کروں۔

مسولینی سے اگر کبھی آپ کی ملاقات ہو تو آپ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ اس کی نگاہ میں ایک ناممکن البیان تیزی ہے جس کو شعاعِ آفتاب سے ہی تعبیر کرسکتے ہیں۔ کم از کم مجھ کو تو اس قسم کا احساس ہوا۔

۴۔ آپ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے لکچرر ہیں۔ اس واسطے مجھے یقین ہے کہ لٹریچر کے اسالیب بیان سے مجھ سے زیادہ واقف ہیں۔ تیمور کی روح کو اپیل کرکے تیموریت کا زندہ کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ وسط ایشا کے ترکوں کو بیدار کرنا مقصود ہے۔ تیمور کی طرف اشارہ محض اسلوب بیان ہے۔ اسلوب بیان کو شاعر کا حقیقی view تصور کرنا کسی طرح درست نہیں۔ ایسے اسالیب بیان کی مثالیں دنیا کے ہر لٹریچر میں موجود ہیں۔

والسلام

آپ کا مخلص

محمد اقبال

یہ خط ۱۳؍ مارچ ۱۹۳۷ء کو لکھا گیا جس سے ٹھیک ۳ ماہ پہلے ۱۲؍ دسمبر ۱۹۳۶ء کو ظفر احمد صدیقی نے غالباً اپنے ہم عصر آل احمد سرور کا بنا نام لئے ذکر کردیا تھا جیسا کہ مرحوم نے ۱۹۷۶ء میں میرے والد صاحب اور مجھ کو بتایا تھا کہ وہ صاحب آل احمد سرور ہی ہیں جو کہ ان کے اور علامہ اقبال کے ہم عصر

تھے۔جس پر اقبال نے لکھا تھا کہ معترض قرآن کریم کی تعلیم سے بے بہرہ ہے اور اسلامی تصوف پر اقبال کی تحریروں سے ناواقف ہے۔اقبال نے یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ خودی خواہ مسولینی کی ہو خواہ ہٹلر کی قانون الٰہی کی پابند ہوجائے تو مسلمان ہوجاتی ہے۔اسی لئے اقبال نے آل احمد سرور کو لکھا کہ اگر اس بندۂ خدا (مسولینی) میں شیطان اور ولی کی دونوں خصوصیات ہوں تو میں اس کا کیا علاج کروں۔ انھوں نے سرور صاحب سے کہا کہ آپ یقیناً لٹریچر کے اسالیب بیان سے مجھ سے زیادہ واقف ہیں۔ (اس کا پس منظر اقبال کا سرور کے نام خط ہے۔)

اسی طرح ان کی یہ غلط فہمی بھی دور کردی تھی کہ اقبال نے اپنی مشہور نظم میں جو ضرب کلیم میں تیمور کی روح کو اپیل کرتے ہوئے لکھی ہے، کا مقصد تیموریت کا زندہ کرنا نہیں ہے بلکہ وسط ایشیا کے ترکوں کو بیدار کرنا مقصود ہے کیونکہ تیمور کی طرف اشارہ محض اسلوب بیان ہے۔دراصل اسلوب بیان کو شاعر کا حقیقی نظریہ سمجھنا کسی طرح درست نہیں کیونکہ اسلوب بیان کی مثالیں دنیا کے لٹریچر میں موجود ہیں۔اقبال نے زمانۂ حال کے تمام ازموں کو رد کر دیا ہے اور صرف اسلام ہی کو واحد عقیدۂ نجات کہا ہے۔اس سے ۳ مہینے قبل وہ اس سلسلہ میں تصوف غیر اسلامی کی تردید کر چکے ہیں جن کا وجود اسلامی تاریخ میں بغداد کی تباہی سے بھی زیادہ خطرناک تھی جس کے خلاف اقبال نے تمام عمر جہاد کیا ہے۔ظفر احمد صدیقی نے آل احمد سرور جیسے لوگوں کے خیالات کی اپنے خط کے ساتھ منسلک نظم میں تردید کی ہے جو کہ ان کے مجموعۂ کلام میں بھی شامل ہے۔(۷) اس نظم کے جواب میں اقبال نے مندرجہ ذیل خط لکھا جس کا عکس اقبال نامہ، علی گڑھ میگزین (اقبال نمبر ۱۹۳۸ء) اور کلیاتِ مکاتیبِ اقبال میں چھپ چکا ہے۔ جس میں انھوں نے ظفر احمد صدیقی کی ایک غلط فہمی برائے شاہین بھی دور کردی ہے اور اپنی حقیقی پوزیشن کی بھی بخوبی وضاحت کردی ہے۔۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کی بنیاد پڑی تھی جس کا خطبہ پریم چند نے پڑھا تھا۔نوجوان تیزی سے کمیونزم کی طرف جارہے تھے مگر اقبال نے اس تحریک کا سختی سے رد کیا اور انھوں نے فی الحقیقت ان سب ازموں کو غلط بتایا اور ان کا نظریہ ہی حقیقت میں صحیح ثابت ہوا۔(۸)

لاہور، ۱۲؍دسمبر ۱۹۳۶ء

جناب من! معترض......

قرآن کریم کی تعلیم سے بے بہرہ ہے، علیٰ ہذا القیاس۔اسلامی تصوف میں مسئلہ خودی کی

تاریخ اور نیز میری تحریروں سے ناواقف محض ہے۔ موخرالذکر صورت میں میں اسے معذور جانتا ہوں۔ آخر اس غلامی کے زمانہ میں مسلمانوں کے پاس کون سا ذریعہ ہے جس سے وہ اپنی آئندہ نسلوں کو اسلامی تصورات کے بننے اور بگڑنے کی تاریخ سے آگاہ کرسکے۔ غلام قومیں مادیات کو روحانیت پر مقدم سمجھنے پر مجبور ہوجاتی ہیں اور جب انسان میں خوئے غلامی راسخ ہوجاتی ہے تو ہر ایسی تعلیم سے بیزاری کے بہانے تلاش کرتی ہیں جس کا مقصد قوت نفس اور روحِ انسانی کا ترفع ہو۔

۲۔ اعتراض کا جواب آسان ہے۔ دین اسلام جو ہر مسلمان کے عقیدہ کی رو سے ہر شے پر مقدم ہے نفس انسانی اور اس کی مرکزی قوتوں کو فنا نہیں کرتا بلکہ ان کے عمل کے لیے حدود معین کرتا ہے۔ ان حدود کے معین کرنے کا نام اصطلاح اسلام میں شریعت یا قانون الٰہی ہے۔ خودی خواہ مسولینی کی ہو خواہ ہٹلر کی، قانون الٰہی کی پابند ہوجائے تو مسلمان ہوجاتی ہے۔ مسولینی نے حبشہ کو محض جوع الارض کی تسکین کے لیے پامال کیا۔ مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانہ میں حبشہ کی آزادی کو محفوظ رکھا۔ فرق اس قدر ہے کہ پہلی صورت میں خودی کسی قانون کی پابند نہیں۔ دوسری صورت میں قانون الٰہی اور اخلاق کی پابند ہے۔ بہرحال حدودِ خودی کے تعین کا نام شریعت ہے اور شریعت کو اپنے قلب کی گہرائیوں میں محسوس کرنے کا نام طریقت ہے۔ جب احکام الٰہی خودی میں اس حد تک سرایت کر جائیں کہ خودی کے پرائیویٹ امیال و عواطف باقی نہ رہیں اور صرف رضائے الٰہی اس کا مقصود ہوجائے تو زندگی کی اس کیفیت کو بعض اکابر صوفیائے اسلام نے فنا کہا ہے۔ بعض نے اسی کا نام بقا رکھا ہے لیکن ہندی اور ایرانی صوفیہ میں سے اکثر نے مسئلہ فنا کی تفسیر فلسفۂ ویدانت اور بدھ مت کے زیر اثر کی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اس وقت عملی اعتبار سے ناکارہ محض ہے۔ میرے عقیدہ کی رو سے یہ تفسیر بغداد کی تباہی سے بھی زیادہ خطرناک تھی اور ایک معنی میں میری تمام تحریریں اسی تفسیر کے خلاف ایک قسم کی بغاوت ہیں۔

۳۔ معترض کا یہ کہنا کہ اقبال اس دور ترقی میں جنگ کا حامی ہے غلط ہے۔ میں جنگ کا حامی نہیں ہوں نہ کوئی مسلمان شریعت کے حدودِ معینہ کے ہوتے ہوئے اس کا حامی ہوسکتا ہے۔ قرآن کی تعلیم کی رو سے جہاد یا جنگ کی صرف دو صورتیں ہیں: محافظانہ اور مصلحانہ۔ پہلی صورت میں یعنی اس صورت میں جب کہ مسلمانوں پر ظلم کیا جائے اور ان کو گھروں سے نکالا جائے مسلمانوں کو تلوار اٹھانے کی اجازت ہے (نہ حکم) دوسری صورت میں جس میں جہاد کا حکم ہے ۹:۴۹ میں بیان ہوئی ہے۔ ان

آیات کو غور سے پڑھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ چیزیں جس کو سیموئل ہور جمعیت اقوام کے اجلاس میں Collective Security کہتا ہے قرآن نے اس کا اصول کس سادگی اور فصاحت سے بیان کیا ہے۔ اگر گزشتہ زمانہ کے مسلمان مدبرین اور سیاسیین قرآن پر تدبر کرتے تو اسلامی دنیا میں جمعیت اقوام کے بنے ہوئے آج کئی صدیاں گزر گئی ہوتیں جمعیت اقوامِ جو زمانہ حال میں بنائی گئی ہے اس کی تاریخ بھی یہی ظاہر کرتی ہے کہ جب تک اقوام کی خودی قانونِ الٰہی کی پابند نہ ہوامنِ عالم کی کوئی سبیل نہیں نکل سکتی۔ جنگ کی مذکورہ بالا دو صورتوں کے سوائے میں اور کسی جنگ کو نہیں جانتا۔ جوعِ الارض کی تسکین کے لیے جنگ کرنا دین اسلام میں حرام ہے۔ علیٰ ہذا القیاس، دین کی اشاعت کے لیے تلوار اٹھانا بھی حرام ہے۔

۴۔ شاہین کی تشبیہ محض شاعرانہ تشبیہ نہیں ہے۔ اس جانور میں اسلامی فقر کے تمام خصوصیات پائے جاتے ہیں: ۱۔ خوددار اور غیرت مند ہے کہ اور کے ہاتھ مارا ہوا شکار نہیں کھاتا۔ ۲۔ بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا۔ ۳۔ بلند پرواز ہے۔ ۴۔ خلوت پسند ہے۔ ۵۔ تیز نگاہ ہے۔

آپ کے خط کا جواب حقیقت میں طویل ہے لیکن افسوس کہ میں طویل خط لکھنا تو درکنار معمولی خط و کتابت سے بھی قاصر ہوں۔

والسلام

(اقبال نامہ) (عکس)

(تفصیلات احکام جنگ کے لئے دیکھئے: ابوالاعلیٰ مودودی الجہاد فی الاسلام، اعظم گڑھ ۱۹۳۰ء جس کے پڑھنے کا اقبال نے ہر پڑھے لکھے مسلمان کو مشورہ دیا ہے۔

☆☆☆

---

(۱) صحیفۂ اقبال ۱۹۸۹ء، لاہور۔ (۲) آخر ستمبر ۱۹۳۳ء، شاعر اقبال نمبر ۱۹۸۸ء۔ (۳) شاعر اقبال نمبر ۱۹۸۸ء، صفحہ ۴۰۷۔ (۴) ایضاً ص ۴۰۸۔ (۵) بشیر احمد ڈار Writings and Letters of Iqbal (۶) نودریافت خط آل احمد سرور کلکشن نیشنل آرکائیوز آف انڈیا، جن پتھ، نئی دہلی۔ (۷) کلیات ظفر احمد صدیقی۔ (۸) لاہور، ۱۲ر دسمبر ۱۹۳۶ء۔

مرزا دبیرؔ کا بے مثال ولاجواب آخری کلام (۲۰۱۹ء)

مرزا کی آخری ادبی ودبیری الہامی آواز (۱۴۴۰ھ)

☆ جناب زاہد الجعفری

ہمارے تمام نامور شعرا از میر تقی میر تا ناسخ وآتش اپنے اپنے رنگ کے موجد اور فرد کامل تھے لیکن ان کاملین فن کی تمام خوبیاں جس ذات واحد میں جمع ہوگئی تھیں وہ خدائے سخن میر انیسؔ کی ہستی تھی جس کا اعتراف خود مرزا دبیرؔ کو تھا۔ ان کی شاعری، شاعری نہ تھی بلکہ ایک معجزہ تھی اور وہ بھی ایک مذہبی حد میں محدود اور وہ بھی اتنی لامحدود کہ اصول فن سے بال بھر بھی ادھر ادھر نہیں۔ کمال فن کی آخری حد وہاں ہے جہاں وہب وکتب میں امتیاز نہ رہ جائے۔

اگر میر انیس کو میر خلیق نے انیس بنایا تو مرزا سلامت علی کو میر ضمیر نے دبیر بنادیا، دبستان لکھنؤ کا آفتاب غزل جہاں (مصحفی وانشاو ناسخ وآتش کے ساتھ) غروب ہوا تھا وہیں اس کی فضائے شفق سے ہلال مرثیہ طلوع ہوا اور انیس ودبیر کی خلاقیت سے بدر کامل ہوگیا۔ دونوں نے مرثیے کو ایک مستقل علم بنادیا اور وہ بھی ایسا کہ جو لازوال وابدی ہوگیا۔ دونوں کی حیات وحالات وادبی خدمات میں بے پناہ یکسانیت ومماثلت ہے کہ کون کس سے کتنا بڑا ہے، فیصلہ ممکن ہی نہیں، دونوں ایک دوسرے کے ایسے جواب تھے جو لاجواب تھے۔ دونوں کربلا کی بولتی ہوئی پاکیزہ اور ہمہ جہت کتاب تھے۔ دونوں نے لاکھوں اشعار کہے، دونوں میں نہ کبھی معاصرانہ چشمک ہوئی اور نہ تعلقات کے بیچ کوئی حاسدانہ خلیج حائل ہوئی۔ مضامین میں توارد ہونا چیزے دیگر یست کہ موضوع (کربلائیت) ایک ہی تھا، نظم میں تقدم وتاخر کے امکانات بحور واوزان میں یکسانیت سب کچھ تھا۔

☆ جلال پور، امبیڈکر نگر (یو۔پی)۔

دونوں میں عقیدت اور آپسی محبت اتنی تھی کہ انیسیوؤں و دبیریوں کی آپسی حرکتیں ناشائستہ انداز دونوں کے لیے تکلیف دہ تھے۔ دونوں نے مرثیے کو معراج پر پہنچا دیا مگر ایسی ایسی نئی شاہراہیں نکال لے گئے کہ مرثیہ انقلابی نعرہ لگاتا ہوا عوام الناس کو پیغام بیداری اور تحریک عمل دینے لگا۔

میر انیسؔ و مرزا دبیرؔ اتنے غیور تھے کہ غدر کے پہلے کبھی کہیں لکھنؤ سے باہر نہیں گئے مگر جب واجد علی شاہ معزول کردیے گئے (لکھنؤ شد خراب واویلا ۱۲۷۳ء) اور فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں نظر بند کردیے گئے تو انگریزوں نے لکھنؤ میں قیامت برپا کردی، شاہ نجف سے تحسین گنج تک مکانات ڈھادیے گئے، بارہ دری لوٹ لی گئی، شرفا کی گردنیں اڑادی گئیں، میر انیس کی وہ حویلی اور امام باڑہ منہدم کردیا گیا جو دیانت الدولہ نے نذر کیا تھا، ان کے چھوٹے فرزند میر سلیس گرفتار کرلیے گئے۔ مرزا دبیرؔ خانماں برباد ہوگئے، معاشی حالات ناگفتہ بہ ہوگئے تب یہاں سے وہ عظیم آباد گئے، پھر دوسرے سال انیسؔ بھی گئے، پھر شمس العلماء مولانا سید حامد حسین (صاحب عبقات الانوار) کی زبردست سفارش پر نواب تہور جنگ کے یہاں عشرہ محرم کی مجالس پڑھنے حیدرآباد گئے۔ ڈھلتی ہوئی عمر، گرتی صحت، کمزوری، صدمات، حالات واجد علی شاہ کا دکھ، لکھنؤ سے بمبئی، پونا ہوتے ہوئے گلبرگہ تک ریلوے کا، پھر گلبرگہ سے حسین ساگر تک گھوڑا گاڑی کا مسلسل ۱۰؍دن کا سفر، نتیجۃً حرارت، سردی، زکام اور بخار، کھانسی نے پریشان کردیا، پھر یہ سلسلۂ علالت رکا نہیں، یہاں تک کہ جب مرض الموت میں مبتلا ہوئے، شوال کے آغاز میں کھانا چھوٹ گیا، پیروں پر ورم آگیا، غشی طاری ہونے لگی تو مرزا دبیرؔ عیادت کو تشریف لے گئے اور لپٹ کر تا دیر روتے رہے۔ آخر ۲۹ شوال کو غروب آفتاب سے پہلے یہ آفتاب سخن ڈوب گیا۔ ۱۰؍دسمبر کی سردی کے باوجود رات بھر مرزا وہیں رہے۔ تجہیز و تکفین میں شریک رہے، سلیمان قدر بہادر (برادر نواب واجد علی شاہ) نے میر خورشید علی نفیس (فرزند انیس) کے کندھے پر سیاہ شال عزا ڈالی، مرزا دبیرؔ پر اپنی شال اڑھائی اور گلے لگا کر چیخ مار کر رو دیے۔ یہ دونوں کی آپسی محبت نہیں تو پھر کیا ہے؟

مجلس سوم میں سید تقی کے امام باڑے میں شاعروں نے تعزیتی قطعات پڑھے، آخر میں میر نفیسؔ نے مرثیے کے اشعار پڑھے، ہزاروں سوگواروں میں کہرام مچ گیا۔ پھر سب سے آخر میں مرزا دبیرؔ نے فارسی کا وہ تاریخی قطعہ پڑھا جس کا آخری شعر سنگ مرمر پر قبر کے سرہانے آج بھی

موجود ہے، ایک ایک شعر دبیر کے کربِ دلی کا خونیں مرثیہ ہے اور احساسِ غم کا ایسا پر درد و عقیدت مندانہ اظہار یہ ہے جو تمام جھوٹی مناقشانہ روایتوں کی تردید کرتا ہے، اسی سال چند مہینے پہلے مرزا صاحب کے بڑے بھائی مرزا بے نظیرؔ کا بھی انتقال ہوا تھا۔ دل پر دہرا غم تھا۔ پڑھنے سے پہلے چیخ چیخ کر گریہ کیا، پھر سسکتے ہوئے کہا ؎

وا دریغا! عینی و دینی دو بازویم شکست — بے نظیر اول شدم و امسال آخر بے انیسؔ

یادگار رفتگاں ہستیم و مہمانِ جہاں — چند روزہ، چند ہفتہ بے برادر بے انیسؔ

آخر یہی ہوا۔ تین مہینے بھی نہ گزرے تھے کہ ۲۹ محرم کو یہ چاند بھی ڈوب گیا اور یکسانیت دیکھیے کہ دونوں موت غروبِ آفتاب سے پہلے ہوئی، وہ ۲۹ شوال ۱۲۹۱ھ کو اس دنیا سے گئے، یہ ۲۹ محرم ۱۲۹۲ھ کو سدھارے، وہ ۱۰؍دسمبر ۱۸۷۴ء کو اٹھے، ۲۹ مارچ ۱۸۷۵ء کو ان کی رحلت ہوئی، دونوں کے انتقال کا ایک ہی دن پنجشنبہ تھا۔ کتنی رفاقت تھی ان دونوں میں؟

ایک تو بھائی کا غم دوسرے انیسؔ کا غم، دونوں بازو ٹوٹ گئے۔ دل کی دنیا اجڑ گئی تو ہزاروں سوگوارانِ انیس کے سامنے علی الاعلان روتے ہوئے منبر سے صاف کہہ دیا ؎

داد خواہم یاغیاث المستغیثین الغیاث — از کہ دل مایوس گردد بے سخنور بے انیس

الوداع اے ذوقِ تصنیف! الفراق اے شوقِ نظم — شد حواس خمسہ ودہ عقل ششدر بے انیس

پوست کندہ موشگافانِ سخن گویند حیف — ہر سرمو بر رگ جانست نشتر بے انیس

اے ہوس چنداں دل آسودہ درعالم کجاست — دفتر اجزائے معنی گشت ابتر بے انیس

اشک را ربطے بدامن بود لیکن اشک ما — رفتہ رفتہ رفت تا دامانِ محشر بے انیس

مرزا سلامت علی دبیرؔ نے میر انیسؔ کی وفات کے بعد مرثیہ کہنا ترک کر دیا اور ہمہ وقت اپنے برادر عینی اور برادر دینی کے سوگ میں مغموم اور اداس رہتے تھے۔ اسی لیے خاکسار نے اس نظم کو مرزا کا آخری کلام مانا ہے، اس سلسلے میں کوئی تاریخ کسی مرثیے یا سلام کی نشاندہی بھی نہیں کرتی، آگے محققین جانیں!

مرزا دبیر کے اس فارسی قطعہ میں پندرہ اشعار ہیں اور مادہ تاریخ والا شعر تمام تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے۔ میں آخری تین اشعار کا حوالہ اس لیے دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کم علم کو اسی کی روشنی میں کچھ

عرض کرنا ہے۔زبرو بیّنات کے امتزاج اور شاعر اعظم کے کمال فن کا سارا اعجاز انہیں میں پوشیدہ ہے ؂

سالِ تاریخش بزر و بینہ شد زیب نظم		طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس
درسنین عیسوی تاریخ گفتم صاف صاف		گرچہ طبعم بود محزون و مکدر بے انیس
آسماں بے ماہِ کامل، سدرہ بے روح الامیں		طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس

۱۵۳+۱۲+۴۶+۹۱+۲۶۹+۱۲+۳۴۶=۴۲۹		۲۱۵+۱۲۱+۱۲+۱۰۰+۶۶+۶+۲۹۲+۱۲+۱۲۱=۹۴۵

۴۲۹+۹۴۵=۱۸۷۴ء

مندرجہ بالا آخری دونوں مصرعے حساب ابجد سے نکالے گئے ہیں، پھر دونوں کے اختلاط سے مادۂ عیسوی میں کمال دکھایا ہے جو میں نے اوپر لکھ کر اعداد کی تشریح کر دی ہے۔اب دوسرا مصرع ہجری مادے کا ہے جو نہایت پیچیدہ اور دشوار ترین ہے، اس کے لیے خاکسار نے بڑی جانفشانی کی ہے۔کئی راتیں جاگ جاگ کر نتیجہ نکالا ہے۔مختلف قوانین کی صورتوں کو بار بار جانچا پرکھا اور جوڑا، تب اس معمے کا حل پایا۔مجھے سخت حیرت ہے کہ تمام تذکرہ نگاروں اور دانشوروں نے اس مصرع کا حوالہ تو دیا ہے مگر نہ کہیں اس کی وضاحت دیکھی اور نہ کہیں اس کا حل ہی نگاہ سے گزرا، میں تو اس چیز کو لاعلمی یا کوتاہ بینی نہیں بلکہ سہل پسندی سمجھتا ہوں اور بس۔

اس پیچیدگی کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ حساب ابجد یا علم ادریسی یا زُبر یا جُمل صغیر صوری ہوتا ہے۔اعداد اکائی، دہائی، سیکڑہ، ہزار تک طے ہیں مگر جُمل کبیر یعنی بیّنات میں معنوی اعداد لیے جاتے ہیں یعنی اس کا تعلق ملفوظی صورت سے ہوتا ہے۔جس حرف کو جس انداز میں بولا جاتا ہے اسی کو لفظ میں لکھ کر عدد نکالا جاتا ہے، جیسے زبر میں الف کا عدد ایک ہے مگر بیّنہ میں (ال ف) کا عدد ایک سو گیارہ ہو جاتا ہے۔

دوسری صورت میں پہلا حرف چھوڑ دیا جاتا ہے، جیسے ال ف میں سے الف نکل گیا تو ل ف کا عدد ایک سو دس رہ گیا، تیسری صورت میں حرف کو لفظ میں لکھ کر جوڑا جاتا ہے، جیسے الف کو (یک) لکھ کر اس کا عدد تیس کر لیا۔

چوتھی صورت میں مخصوص لفظ یا الفاظ سے تاریخ ظاہر کی جاتی ہے۔

پانچویں صورت یہ ہے کہ کبھی کبھی کسی خاص لفظ کو لکھ کر اس کے نیچے گنتی لکھ کر سال مطلوبہ کا

اظہار کیا جاتا ہے۔ یہ نابغہ یا عجیب یا نادر صنعت ہے، اس میں صرف اکائی کا حرف کام کرتا ہے، اس لیے یہ اتفاق سے سامنے آتی ہے اور یہ بات تو قطعی طے ہے کہ فن تاریخ گوئی میں حرف مشدّد ایک ہی مانا جاتا ہے، جیسے لفظ محمد کا عدد ۹۲ طے ہے، اسی دھوکے میں کچھ لوگوں کو لفظ اللہ کے عدد میں زبردست تسامح ہوگیا ہے، کچھ اس کا عدد (ال ہ) ۳۶ بتاتے ہیں، اوپر والا الف ندارد کرتے ہوئے زبر کی آواز مانتے ہیں، کچھ الف کو لے کر ۳۷ مانتے ہیں، کوئی ملفوظی اعتبار سے (ال ل ف ہا) ۳۰۷ کو دوسرے لام کو چھوڑ کر ۲۹۹، کوئی ایک الف دو لام ایک ہا (۱+۳۰+۳۰+۵) ۶۶ مانتا ہے اور یہی عدد درست بھی ہے کیوں کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کا عدد ۷۸۶ طے، تو بغیر ۶۶ مانے یہ عدد غلط ہو جائے گا۔ مرزا دبیرؔ نے یہی عدد (۶۶) مان کر مادّے میں داخل کیا ہے اور دوسرا نکتہ یہ ہے کہ مرزا صاحب نے (ط۔ب) کا عدد بولنے کے اعتبار سے لیا ہے، لوگ (ط) کو طوئے اور (ب) کو بے بھی بولتے ہیں۔ یہ مسئلہ مجھ سے بڑی مشکل سے طے ہوا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ طوئے کا پہلا حرف (ط) نکال دیا تو (و+ی) کا عدد ۱۶؍ بچا۔

۲۔ واوٗ+را کا عدد ملفوظی ۲۱۴ ہے، اس میں اوپر والا حاصل شدہ عدد جوڑا تو (۱۶+۲۱۴) ۲۳۰ ملا۔

۳۔ سینا کا (سین) نکالا تو (یا نون الف) کا عدد (۱۱+۱۰۶+۱۱۱) ۲۲۸؍ ملا۔

۴۔ بے کا (ب) نکالا تو (یا) کا عدد ۱۱؍ ملا۔

۵۔ کلیم کا (ک) نکال دیا تو (لام میم یا) کا عدد (۷۱+۱۱+۹۰) ۱۷۲؍ ملا۔

۶۔ اللہ کا عدد طے شدہ تو ہے ہی (۶۶)۔

۷۔ واوٗ کا پہلا حرف (و) گیا تو (ا+و) کا عدد ۷ بچا۔

۸۔ منبر کا پہلا حرف (میم) چھوڑ دیا تو (نون بارا) کا عدد ۱۰۶+ ۳+۲۰۱) یعنی ۳۱۰ ہاتھ آیا۔

۹۔ بے کا (ب) گیا تو باقی بچا (یا)، اس کا عدد ۱۱؍ رہے۔

۱۰۔ انیس کا (الف) نکالا گیا تو نون یا سین بچا، اس کا عدد (۱۰۶+۱۱+۱۲۰) ۲۳۷ ملا۔

اب کل کا مجموعہ ۲۳۰+۲۲۸+۱۱+۱۷۲+۶۶+۷+۳۱۰+۱۱+۲۳۷=۱۲۷۲؍ ہو گیا۔

اب کیا کیا جائے کہ ۱۲۹۱؍ ہو جائے۔ اوپر والا تو امکانی صورتوں کے علاوہ اب کوئی راستہ نہیں رہ گیا۔ ۱۹ کا عدد چاہیے تو سب سے پہلا مصرعہ پھر دیکھیے، لفظوں میں جھانکیے وہیں یہ عدد روپوش ہے اور سوائے

تعمیہ کی کنجی کے علاوہ یہ قفل ابجد کوئی نہیں کھول سکتا، اب ہر لفظ غور سے دیکھیے کہ ۱۹؍ کا عدد کس لفظ میں ہے، دیکھا تو لفظ ''ذیب'' کا عدد مل گیا، اس کو تعمیہ سے جوڑ دیا (۱۲۷۲+۱۹) تو مطلوبہ سن ہجری پورا ہوگیا، دیکھا آپ نے کتنی سنگلاخ زمینوں کا سفر دماغ نے طے کیا تو یہ نایاب منزل ملی، دل صاحب انصاف سے انصاف طلب ہے............دادخواستم مہربانم!

شاعر اعظم دبیرؔ اعلی اللہ مقامہ نے دو مصرعوں کے اجتماع سے سن عیسوی اور بیّنات سے سن ہجری نکال کر کمال دیا۔ اس کی ایک صورت اور بھی ہے، ایک ہی مصرعے میں دو دو سن بھی نکالے جاسکتے ہیں اور ایک مصرعے میں تیسرا سن بھی برآمد کیا جاسکتا ہے، یہ تو مشکل مگر ناممکن بھی نہیں، جیسے کسی استاد نے میر انیسؔ و مرزا کا سن وفات نکالا تو میں نے پہلا مصرعہ لگا کر تضمین کی تو ایک سن اور سامنے آگیا:

جب اپنے دل میں چلے لے کے مرزا میرؔ کا غم　　غمِ انیسؔ نے ہے ہے، دیا دبیرؔ کا غم

۵+۶۳+۳۴+۱۰۰+۴۳+۴۰+۳۰+　　۱۲۹۱　ہجری　۱۲۹۲

۲۴۸+۲۵۰+۲۱+۱۰۴۰=۱۸۷۴ (عیسوی)

جب میر انیسؔ مرض الموت میں تھے، اطبا مایوس ہوگئے تو اسی کیفیت کو ذہن میں رکھ کر میں نے لفظ ''اطبا'' سے یوں سن برآمد کیا:

ا　ط　ب　ا

۱　۹　۲　۱　ہجری

آ گیا مرثیہ گوئی کا گہن میں سورج　　اقربا غم سے ہیں سکتے میں، احبا خاموش

زاہدا! لکھ دے یہ تاریخ وفاتِ سید　　بے انیسؔ آہ ہے صفِ ہائے اطبا خاموش

۱۸+۵۵+۱۴+۱۵+۱۲۱۱+۴۸۷+۷۲+=　　۱۲+۱۲۱+۷+۱۵+۱۵۰+۲۶+۱۳+۹۴۷=

سن ۱۸۷۴؍ عیسوی　　۱۲۹۱؍ ہجری

مرزا دبیر کے لیے میری کاوش فکر دوسوسال کے بعد یہ مادۂ تاریخ ڈھونڈ نکالا ہے؎

کلک و اوراق بلاغت غرق بحر یاسیت　　بے معانی حرف حرف بے رنگ مسطر بے دبیرؔ

بازبان ما می آید آہ تاریخ وفات　　بود منبر بے انیس و شد کہ منبر بے دبیرؔ

۳+۶۰+۴۱+۵۰+۱۶+۷+۱۲۱۱+۴۸۷=　　۱۲+۲۹۲+۱۲+۱۲۱+۶+۳۰۴+۲۵+۲۹۲+۱۲+۲۱۶=

سن ۱۸۷۵؍ عیسوی　　۱۲۹۲؍ ہجری

جب کلکتہ میں نواب واجد علی شاہ کو دونوں کے مرنے کی خبر ملی تو ایک آہِ سرد بھری اور یہ دردو حسرت یہ شعر کہا:

لو اٹھ گئے دنیا سے انیس اور دبیر افسوس کہ قدردانِ اختر نہ رہے

مفتی میر عباس جزائری عربی فارسی اردو سیکڑوں کتابوں کے مصنف تھے، وہ میر انیسؔ کے بہت عزیز دوست اور شاگرد بھی تھے۔ ان کی تعزیتی نظم خون کے آنسو رلا دیتی ہے اور ایک پانچ شعر کی ان کی نظم بھی ہے جو میر انیس کی مشہور رباعی میں صرف ایک لفظ کا اضافہ کر کے سن ہجری برآمد کر لیا ہے رباعی میر انیسؔ ؎

آغوشِ لحد میں جب کہ سونا ہوگا جز خاک، نہ تکیہ نہ بچھونا ہوگا
تنہائی میں آہ کون ہوگا انیسؔ ہم ہوں گے اور قبر کو کونا ہوگا

مفتی میر عباس کے آخری دو شعر اس طرح ہیں:

مدح میں اس کی کسے گویائی ہے؟ کون ایسا ہے؟ جو اس طرح کا گویا ہوگا
سال تاریخ بھی گویا کہ کلام ان کا ہے ہائے! جز خاک، نہ تکیہ نہ بچھونا ہوگا

۲۶+۱۰+۶۲۱+۵۵+۴۳۵+۵۵+
۶۷+۱۱+۲۱=۱۲۹۱ہجری

☆☆☆

کلمہ سواء کی تفسیریں

☆ مولوی فضل الرحمٰن اصلاحی

لفظ سواء کی لغوی تحقیق: المنجد میں سواء کا معنی العدل، المثل دیا ہے۔ ''السواء'': العَدل، المثل، یقال ''هما فی هذا الأمر سواء'' اسی طرح ایک معنیٰ چودھویں رات کا بھی ہے۔

'' لیلة السواء: هی لیلة اربع عشرة اور ثلاث عشرہ لاستواء القمر فیها''۔

تاج العروس میں ہے:

''السواء'' العدل و منه قوله تعالیٰ فانبذ الیهم علیٰ سواء''

لسان العرب میں ہے:

السویّه والسواء : العدل و النصفة، قال تعالیٰ : قُلۡ یٰۤاَهۡلَ الۡکِتٰبِ تَعَالَوۡا اِلٰی کَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَیۡنَنَا وَبَیۡنَکُمۡ، أی عدل۔

کلام عرب سے استشہاد: قدیم شعرائے عرب میں بھی یہ لفظ موجود ہے:

مثلاً زہیر بن ابی سلمیٰ کہتا ہے:

آرونی خُطّة لا عیبَ فیها یُسّوِی بیننا فیها السِّواء

اور حسانؓ بن ثابت کا شعر ہے:

یا ویحَ اصحابِ النّبی ورَهطِه بعد المُغیب فی سواء المُلحد

ایک مصرعہ ہے:

أبینَا فلا نعطی السواء عدوّنا۔

☆ اسکالر دار المصنّفین، اعظم گڑھ۔ E-mail: islahi1980@gmail.com

ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ لفظ سواء سے مراد، دو چیزوں میں قدرِ مشترک یا دو چیزوں میں برابری اور یکسانیت ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں: سواء کے معنی وسط کے ہیں، ''سواء الرأس'' سر کے بیچ کے حصے کو کہیں گے۔ 'سواء الطریق' کے معنی ہوں گے وسط شاہراہ، جو چیز دو جماعتوں کے بیچوں بیچ ہوگی وہ دونوں میں یکساں، مشترک، مسلّم اور جانی پہچانی ہوئی ہوگی۔(۱)

سواء کی تشریح مختلف تفسیروں کے آئینے میں: تفسیر طبری میں ہے: ''تعالوا''، ''ھلموا'' ا۔ الیٰ کلمۃ سواء' یعنی الیٰ کلمۃ عدل بیننا و بینکم ۲۔ والکلمۃ العدل، ھی أن نوحِّد اللہ فلا نعبد غیرہ ونبرأ من کل معبود سواء، فلا نشرك بہ شیئاً۔(۲)

علامہ جار اللہ زمخشری لکھتے ہیں۔

''مستویۃ بیننا و بینکم، و لا یختلف فیھا القرآن والتوراۃ والانجیل، و تفسیر الکلمۃ قولہ أن نعبد اللہ ولا نشرك بہ شیئاً...... یعنی تعالوا الیھا حتّٰی لا نقول: عزیر ابن اللہ، ولا المسیح ابن اللہ، لأن کل واحدٍ منھا بعضا بشر مثلنا۔(۳)

علامہ قرطبی نے لکھا اور کلام عرب کی مثال بھی دی کہ'' ...... والسواء، العدل والنصفۃ، قالہ قتادۃ وقال زھیر:

ارونی خُطّۃ لا ضیم فیھا یُسِوّی بیننا فیھا السِّواء

فرّاء کی روایت بھی نقل کی جس میں ''الیٰ کلمۃ سواء' کی جگہ الیٰ کلمۃِ عدلٍ موجود ہے:

''الفرّاء: قال وفی قراءۃ عبید اللہ ''الیٰ کلمۃ عدل بیننا و بینکم''(۴)

امام ابوبکر احمد بن علی الرازی جصاصؒ لکھتے ہیں۔

''قولہ تعالیٰ کلمۃ سواء یعنی واللہ اعلم کلمۃ عدلٍ بیننا و بینکم نتساوٰی جمیعاً فیھا اذ کُنّا جمیعاً عباد اللہ ثُمَّ فسّرھا لقولہ تعالیٰ اَلّا نعبد .... من دون اللہ و ھٰذہ ھی یا أھل الکتاب لِم تحاجُّون فی ابراھیم وما أنزلتِ التوراۃ والانجیل الّا من بعدہ افلا تعقلون''۔(۵)

امام راغب اصفہانی نے ''کلمۃ سواء'' سے مراد توحید کو لیا ہے اور اس کی تشریح میں لکھا ہے:

"......وسواء وسّوی: وسط، یعنی به العدل، وقول الربیع وابی العالیة (کلمة سواءٍ) هی لا اله الا الله، فصحیح، لأن أبلغ العدالة التوحید وهی الکلمة الّتی یجب أن یتساوی الناس فیها، وفی أن یکونوا عابد ین غیر معبودین، بخلاف ما ادّعتّه النصاریٰ"۔ (۶)

مفتی شفیع صاحب نے آیت کے ذیل میں ایک عنوان "تبلیغ ودعوت کے اہم اصول" قائم کیا ہے اور اس کی تشریح کرتے ہوئے بخاری شریف سے ایک حدیث بھی پیش کی ہے جس میں قیصرِ روم کی طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خط روانہ فرمایا تھا اسی آیت کو بطور دلیل پیش کیا ہے۔ مفتی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"تعالوا الیٰ کلمة سواءٍ بیننا وبینکم" اس آیت سے تبلیغ ودعوت کا ایک اہم اصول معلوم ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی ایسی جماعت کو دعوت دینے کا خواہش مند ہو جو عقائد و نظریات میں اس سے مختلف ہو، تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ مخالف العقیدہ جماعت کو صرف اسی چیز پر جمع ہونے کی دعوت دی جائے، جس پر دونوں کا اتفاق ہو سکتا ہو، جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب روم کے بادشاہ ہرقل کو اسلام کی دعوت دی تو ایسے مسئلہ کی طرف دی، جس پر دونوں کا اتفاق تھا، یعنی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

"یأهل الکتاب" کا خطاب اگرچہ یہود ونصاریٰ دونوں سے یکساں ہے۔لیکن اس سورہ میں نصاریٰ چوں کہ خاص طور پر مخاطب ہیں، اس وجہ سے روئے سخن ان کی طرف زیادہ ہے،...... توحید کے متعلق قرآن مجید کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ اہل کتاب اور مسلمانوں کے درمیان یکساں مشترک و مسلّم ہے۔قرآن نے اسی مشترک کلمہ کو بنیاد قرار دے کر ان سے بحث کا آغاز کیا ہے کہ جب توحید ہمارے اور تمہارے درمیان ایک مشترک حقیقت ہے تو موازنہ کرو کہ اس قدر مشترک کے معیار پر قرآن اور اسلام پورے اترتے ہیں یا یہودیت اور نصرانیت"۔(۷)

"بحث کا یہ طریقہ قرآن کے اس طریقہ کے بالکل مطابق ہے، چنانچہ قرآن نے یہاں یہی طریقہ اختیار فرمایا ہے۔اہل کتاب آسمانی صحیفوں کے حامل ہونے کے سبب سے توحید کی تعلیم سے

اچھی طرح آشنا بھی تھے اور اس کے علم بردار ہونے کے مدعی بھی تھے۔ ان کے صحیفوں میں نہایت واضح الفاظ میں توحید کی تعلیم موجود تھی''۔(۸)

مولانا اصلاحی ''انجیلوں میں توحید کے شواہد'' کے تحت یہ بھی لکھتے ہیں:

''...... لُوقا ۴:۸ میں ہے۔

''یسوع نے جواب میں اس سے کہا۔ لکھا ہے کہ تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور اسی کی بندگی کر''۔

مرقس ۲۹:۲۔۳۰ میں ہے:

یسوع نے جواب دیا کہ اول (حکم) یہ ہے اے اسرائیل سن! خداوند ہمارا ایک ہی خداوند ہے''۔

یوحنّا ۱۷:۳ میں ہے:

''اور ہمیشہ کی زندگی یہ ہے کہ وہ تجھے خدائے واحد و برحق کو یسوع مسیح کو جیسے تو نے بھیجا ہے جانیں''۔

متّیٰ ۱۹: ۱۷ میں ہے۔

''اس نے کہا کہ تو مجھ سے نیکی کی بات کیوں پوچھتا ہے؟ نیک تو ایک ہی ہے''۔(۹)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اس آیت کے ضمن میں لکھا ہے ''سواء بیننا وبینکم'' یعنی وہ اصل جو ہم کو تم کو دونوں کو مسلّم ہے، جس کی قدر و قیمت وافادیت پر ہم سب کو اتفاق ہے، جس کی تعلیم تمہارے ہاں کے پیغمبرانِ برحق ہمیشہ دیتے آئے ہیں اور یہودیت ونصرانیت دونوں دینوں کی بنیاد اسی اصل پر ہے۔ توریت تو خیر تاکید توحید وممانعت شرک سے لبریز ہی ہے، انجیل تک میں بھی یہی تعلیم موجود ہے، تو خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر۔ (متی ۴:۱۰)(۱۰)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا نقطہ نظر یہ ہے:

''............مسیح کی الوہیت کا اعتقاد تمہارے اندر جن وجوہ سے پیدا ہوا ہے، ان میں سے کوئی وجہ بھی ایسے اعتقاد کے لئے صحیح نہیں ہے۔ ایک انسان تھا جس کو اللہ نے اپنی مصلحتوں کے تحت مناسب سمجھا کہ غیر معمولی صورت سے پیدا کرے اور اسے ایسے معجزے عطا کرے جو نبوت کی صریح علامت ہوں''۔

دوسری اہم بات جو ان کو سمجھائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ مسیح جس چیز کی طرف دعوت دینے آئے

تھے وہ وہی چیز ہے جس کی طرف محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دعوت دے رہے ہیں۔

تیسرے یہ کہ وفد نجران جان بوجھ کر ہٹ دھرمی کر رہا ہے۔

لیکن ان تینوں تقریروں کے درمیان مطالب کی ایسی قریبی مناسبت پائی جاتی ہے کہ شروع سورت سے لے کر یہاں تک کسی جگہ ربط کلام ٹوٹا نظر نہیں آتا۔

اسی بنا پر بعض مفسرین کو شبہہ ہوا ہے کہ یہ بعد کی آیات بھی وفد نجران والی تقریر ہی کے سلسلہ کی ہیں۔ مگر یہاں سے جو تقریر شروع ہو رہی ہے اس کا انداز صاف بتا رہا ہے کہ اس کے مخاطب یہودی ہیں۔ (۱۱)

کلمہ سواء اور داعیوں کا کردار: اسلام کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ ہر مسلمان تمام اگلے رسولوں پر خواہ ان کا نام جانتا ہو یا نہ جانتا ہو اور ایسے ہی تمام کتابوں پر چاہے وہ کسی زبان میں نازل ہوئی ہوں، جب تک دل سے تصدیق نہ کرے مسلمان نہیں ہوسکتا اور بقول مولانا حکیم محمد فاروق صاحب مرحوم "یہ شرف خاص طور پر اسلام ہی کو حاصل ہے کہ اس کا ماننے والا تمام مذہبوں کا ماننے والا کہا جائے گا اور اس کا پیرو کسی دوسرے مذہب کو نفرت سے نہیں دیکھ سکتا اور نہ دنیا کے کسی رہبر کی ادنیٰ برائی کر سکتا ہے، اس کے نزدیک ہر مذہب کے رسول نیک با اخلاق اپنے متبعین کے لئے ایک مکمل نمونہ تھے"۔ (۱۲)

قرآن مجید میں اس مفہوم کی تائید کئی جگہ ہے:

"شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ"۔ (الشوریٰ:۱۳)

تمہارے لئے دین کا وہی راستہ مقرر کیا گیا ہے جس کی ہدایت نوحؑ کو ہوئی تھی، اور جو کچھ تم کو ہم نے بھیجا ہے اور جو کچھ ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو ہدایت کی تھی وہ یہی تھی کہ دین کو قائم رکھو اور اس میں متفرق نہ ہو۔

اس دعوے کی شہادت پر اللہ تعالیٰ کا یہ قول بھی ہے:

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ"۔ (البقرہ:۱۳۶)

اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کو مانا اور اس چیز کو مانا جو ہم پر بھیجی گئی اور جو ابراہیم، اسمٰعیل، اسحاق اور یعقوب اور ان کی اولاد پر بھیجی گئی تھی اور جو موسیٰ اور عیسیٰ کو دی گئی تھی اور جو دوسرے نبیوں کو اپنے رب کی طرف

سے عطا ہوئی۔ ہم ان میں سے کسی کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے۔

قُلْ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ"(آل عمران:۶۴)

اے پیغمبر کہہ دیجئے اے کتاب والو! آؤ اس سیدھی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے یہ کہ ہم اللہ تعالیٰ ہی کی بندگی کریں گے اور نہ شریک کریں گے کسی کو اس کے ساتھ، اور ہم میں سے کوئی کسی کو اور اپنا رب اللہ تعالیٰ کے سوا نہ بنادے، پھر اگر اسے نہ مانیں تو آپ ان سے کہہ دیجئے کہ تم گواہ رہو کہ ہم مسلمان ہیں۔

دیگر مذاہب میں وحدانیت کا تصور: بعض محققین علما کے نزدیک ہندوؤں کی حیثیت شبہ اہل کتاب کی ہے۔ان کی مذہبی کتابوں میں وحدانیت کا تصور پایا جاتا ہے۔ چنانچہ "رگ وید" ایک خدا کا تعارف کراتی ہے مگر اس کے لئے نام مختلف استعمال کئے گئے ہیں، دیانند سرسوتی لکھتے ہیں:

"رگ وید میں ایشور (ईश्वर) کو سوناموں سے ذکر کیا گیا ہے۔ جیسے: ایشور سچد انند سروپ، نراکار، نروکار سرو یشور، ابھے نت وغیرہ۔(۱۳)

وید میں آریاؤں کی دعاؤں میں خدا تعالیٰ کے نام ملتے ہیں اور سب اسمائے صفات ہیں جیسے: اندرن: ساری رحمتوں کا مالک۔ متھرن: سارے لوگوں سے محبت رکھنے والا۔ ویرنن: سب سے زیادہ شرف والا۔ وایو: سب سے زیادہ طاقتور۔ برہما: پیدا کرنے والا۔ ردرا: گنہگار کو سزا دینے والا۔ پرمیشور: بے مثال حکمت والا۔(۱۴)

شیخ محمد ریاض موسیٰ ملیبار یلکھتے ہیں:

"ایک ہی خدا کی عبادت کا طریقہ ویدک دور کے آریہ میں موجود تھا، یگیہ اور تپنی مدت دراز کے بعد انہوں نے شروع کیا تھا۔ خدا کو مختلف ناموں سے پکارنے کے دلائل خود وید میں بھی موجود ہیں"۔

"منتروں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ویدک دور کے آریہ خالص توحید پرست تھے۔ دنیا

کی ہر موحد قوم زمانہ گزرتے گزرتے جس طرح دھیرے دھیرے بگڑتی ہے اسی طرح آریہ بھی رفتہ رفتہ آج کی اس بت پرستی کا شکار نظر آتے ہیں''۔(۱۵)

اس بحث کا منشا یہ ہے کہ اسلام اور دیگر مذاہب میں جو چیز مشترک ہے وہ توحید ہے اور یہ چیز برادران وطن کی مذہبی کتابوں میں بھی کہیں نہ کہیں پائی جاتی ہے۔اس لئے مدعو قوم میں دعوت کا آغاز کلمہ سواء سے ہوسکتا ہے یا ہونا چاہیے مگر بعد کے مراحل میں رسالت اور آخرت کی بات بھی آنی انتہائی ضروری ہے ورنہ اندیشہ ہے کہ کہیں اس کو وحدت ادیان کی دعوت نہ سمجھ لیا جائے۔

یہ بھی قابل غور ہے کہ جب بعض محقق علماء برادرانِ وطن کو شبہ اہل کتاب مانتے ہیں تو ان کو بھی اسی بنیاد پر دعوتِ دین پیش کیا جانا چاہیے۔

بقول ڈاکٹر محمد حمید اللہ مرحوم، زرتشت کہتا ہے کہ برائی کو خدا کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا ...... برائی کا خالق الگ ہے اور بھلائی کا خالق الگ ہے۔اس طرح دو الگ خالق یا خدا ہیں، یہ نظریہ تو نیک نیتی پر مبنی ہے کیونکہ خدا کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے وہ کہتا ہے وہ برائی نہیں کرتا''۔(۱۶)

مولانا مناظر احسن گیلانی کا ایک مقالہ معارف اپریل ۱۹۵۲ء میں ''اسلام اور ہندو مذہب کی بعض مشترک تعلیمات'' کے عنوان سے شائع ہوا، اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''افسوس یہ ہے کہ ہندوستان کے قدیم مذاہب و ادیان کے وثائق اور یادداشتوں کا مطالعہ اس نقطہ نظر سے نہیں کیا گیا ہے۔ورنہ ان ہی کتابوں میں نہیں، جن کے پڑھنے پڑھانے اور سمجھنے سمجھانے کا عام رواج اس ملک میں باقی نہیں رہا ہے اور اسی وجہ سے ان کے مطالب اور معانی کی صحیح یافت دشوار ہوگئی ہے بلکہ مہا بھارت جیسی عام کتاب اسی میں ایسی حیرت انگیز چیزیں مل جاتی ہیں کہ آدمی مبہوت ہوکر رہ جاتا ہے اور یہ ماننا پڑتا ہے کہ قرآن کے ذریعہ سے جو کچھ دیا گیا ہے اس کا بڑا حصہ اب بھی ہندوستان کے باشندوں کے اگلے بزرگوں کی کتابوں میں موجود ہے، قرآنی تعلیمات کا بنیادی مسئلہ اور جوہری روح جیسا کہ سب جانتے ہیں، توحید ہے''۔(۱۷)

اس کے بعد تقابل کرتے ہوئے بعض مثالیں پیش کی ہیں، مثلاً مہا بھارت میں راجہ جدھشٹر کو حکم دیا گیا تھا کہ:

"اسی مزگن دیوتا کا پوجن کر"

الغرض "لیس کمثلہ شیئ" کے تعبیری لباس میں قرآن نے معرفت کی جس تنزیہی شان کو ادا کیا ہے، مہا بھارت کے اس فقرے میں اس کے سوا کیا اور بھی کچھ ہے۔

آگے مہابھارت کی یہ تعلیمات اور قرآن کی سورۂ صافات کی تعلیمات میں کتنا ہم آہنگی معلوم ہوتی ہے:

"جس کے اوپر نارائن کرپا (مہربانی) کریں، اس کا کوئی بگاڑ نہیں سکتا اور جس پر پرمیشور کوپ کریں، اس کو کوئی بچا نہیں سکتا"۔

مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا وما يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْ بَعْدِهٖ (فاطر: ۲)

اللہ آدمی کے لیے جس رحمت کو کھولے اسے کوئی روک نہیں سکتا اور جسے روک دے اسے کوئی کھول نہیں سکتا۔ (۱۸)

مصادر و مراجع

(۱) تفسیر تدبر قرآن مولانا امین احسن اصلاحی جلد اول، دار الاشاعۃ الاسلامیہ لاہور، ۱۹۶۷ء ص ۱۴۷۔ (۲) الطبری العلامہ ابن جریر الطبری، ج ۶، المکتبۃ الشاملۃ سعودی عرب، ص ۴۸۳۔ (۳) الکشاف العلامہ جاراللہ الزمخشری ج ۱، المکتبۃ الشاملۃ، ۳۷۱۔ (۴) القرطبی لابی عبداللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبی، ج ۲، المکتبۃ الشاملۃ، ص ۳۷۱۔ (۵) احکام القرآن للجصّاص، ج ۲، المکتبۃ الشاملۃ، ص ۲۹۷۔ (۶) تفسیر راغب ج ۲، المکتبۃ الشاملۃ، ص ۶۱۳-۶۱۲۔ (۷) تدبر قرآن، ج اول، ص ۱۴۷-۱۳۷۔ (۸) تدبر قرآن، ج اول، ص ۱۴۷۔ (۹) ایضاً ص ۱۵۷۔ (۱۰) تفسیر ماجدی، ج اول، صدقِ جدید بک ایجنسی کچہری روڈ لکھنؤ، سن ندارد، ص ۶۰۰۔ (۱۱) تفہیم القرآن، ج اول، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ۱۹۸۳ء، ص ۲۶۰-۲۶۱۔ (۱۲) پیام حق، مولانا حکیم محمد فاروق صاحب، مدرس جامع العلوم، کانپور، ص ۱۔ (۱۳) ستیارتھ پرکاش، آریہ پستکالیہ، انارکلی لاہور، ۱۹۲۷ء، ص ۴۰۔ (۱۴) ہندو دھرم میں مذہبی داستانیں اور تاریخی حقائق مؤلف شیخ ریاض موسیٰ ملیباری۔ موسیٰ چیریٹیبل ٹرسٹ، حیدرآباد، اکتوبر ۲۰۱۱ء، ص ۲۸۔ (۱۵) خطبات بہاول پور، ڈاکٹر محمد حمیداللہ، اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی۔ ۲۰، ص ۱۹۶۔ (۱۶) وید کا تعارف مولانا محمد فاروق خان ایم۔ اے، مرکزی مکتبہ اسلامی، ۲۰۰۰ء، ص ۱۴۔ (۱۷) معارف اپریل، ۱۹۵۲ء، ص ۲۶۱۔ (۱۸) ایضاً ص ۲۶۳ تا ۲۶۵۔

ہندوستان کی عربی صحافت

اور مولانا واضح رشید ندویؒ

☆ڈاکٹر محمد طارق

عرب صحافت کے لئے لفظ ''الوقائع'' کا استعمال بیسویں صدی کے اوائل میں کرتے تھے اور سب سے پہلے لفظ ''صحیفہ'' کا انتخاب کرنے والے الکونت رشید الدحاح متوفی ۱۸۸۹ء ہیں جبکہ احمد فارس شدیاق متوفی ۱۸۸۷ء نے لفظ جریدہ استعمال کیا اور صحافت بطور فن جس معنی میں آج متعارف ہے اس کا استعمال نجیب حداد متوفی ۱۸۹۹ء نے سب سے پہلے کیا۔(۱)

ابتدائی دور میں عالم عربی میں صحافت کے میدان میں خدمات کے اعتبار سے مصر کے ساتھ ساتھ لبنان کا بھی حصہ رہا ہے مصر انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں عربی صحافت سے متعارف ہو چکا تھا۔ اور لبنان کی سرزمین پر پہلا عربی اخبار ۱۸۵۸ء میں شائع ہوا۔(۲)

ابتدائی دور میں عربی زبان میں ہندوستان میں جو تصنیفات منظر عام پر آئیں ان کے مصنّفین عربی الاصل تھے جن میں أبوالحفص البصری متوفی ۱۶۰ھ/ ۷۷۶ء کا نام سرفہرست ہے۔(۳) پھر ان لوگوں نے اپنی تصنیفات وتالیفات عربی زبان میں پیش کی جن کی پیدائش اور پرورش ہندوستان ہی میں ہوئی ان علماء نے اپنی تصنیفات وتالیفات کو تفسیر، حدیث، فقہ، نحو، صرف، بلاغت، انشاء، ادب، تاریخ اور سیرت وغیرہ کے موضوع پر پیش کیں۔ وہیں بعض اہل علم نے عربی صحافت کی طرف توجہ مبذول کی اور غیر منقسم ہندوستان کے لاہور شہر سے شمس الدین بن محمد عظیم نے ۱۸۷۱ء میں پہلا ہفت روزہ جریدۃ النفع العظیم لأھل ھذا الإقلیم شائع کیا جس کے ایڈیٹر مقرب علی تھے۔ اسی طرح ۱۹۰۲ء میں عبداللہ عمادی نے ماہانہ مجلہ ''البیان'' شائع کیا جو بعد میں مہینے میں دوبارہ شائع ہونے لگا اور اسکے بعد مولانا ابوالکلام آزاد نے پندرہ روزہ ''الجامعۃ'' نامی مجلہ کلکتہ سے شائع کیا۔

۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء میں ندوہ کی تحریک شروع ہوتی ہے اور بالآخر اس تحریک سے جڑے علما

☆اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ عربی لکھنؤ یونیورسٹی۔

نے ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء دارالعلوم کی بنیاد رکھی اور اس دارالعلوم نے روز اول سے ہی قرآن کریم کی تعلیم کے ساتھ ساتھ عربی زبان پر خاص توجہ دی۔ دارالعلوم کے ذمہ داروں نے عرب اُدباء سے درخواست کر کے انہیں یہاں بلایا۔ جن میں ڈاکٹر محمد تقی الدین ہلالی، حجر بن حسین یمنی اور محمد طیب مکی کا نام قابل ذکر ہے۔ ان عرب ادبا نے طلبا کے اندر عربی زبان کا ایک عمدہ ذوق پیدا کر دیا۔

دار العلوم ندوۃ العلماء نے ''الضیاء'' نامی ماہانہ مجلہ ۱۹۳۲ء میں علامہ سید سلیمان ندوی اور علامہ تقی الدین ہلالی کے زیر نگرانی مولانا مسعود عالم ندوی کی ایڈیٹر شپ میں شائع کیا۔ اور تقریبا ۴۰ سال عربی صحافت میں اپنا اہم رول ادا کرتا رہا۔ مگر پھر شائع نہ ہوسکا۔ اس وقت ''العرب'' و''النفیر'' نامی دو عربی مجلّے حکومت ہند کی نگرانی میں شائع ہورہے تھے لیکن ان دونوں مجلوں کا ہندوستانی عوام اور مدارس سے کوئی خاص تعلق نہ تھا۔ البتہ مجلہ ''الضیاء'' کی اشاعت بند ہونے کے بعد بہار کے بعض اہل علم نے ایک عربی مجلہ ''الصبح'' شائع کیا لیکن یہ بھی بعد میں بند ہوگیا۔ ان کے علاوہ عربی کے بعض اہم مجلّات ہیں جن کی فہرست درجہ ذیل ہے۔

مجلہ صوت الشرق (ماہانہ)، ۱۹۰۲ء، ہندوستانی سفارت خانہ، قاہرہ۔ مجلہ البعث الاسلامی (ماہانہ)، ۱۹۵۵ء، دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔ ثقافۃ الہند (سہ ماہی)، ۱۹۵۰ء، آئی۔سی۔سی۔آر، نئی دہلی۔ صحیفۃ الرائد (پندرہ روزہ)، ۱۹۵۹ء، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ صحیفة اليقظه (نجط اليد ثم بالطباعة)، بیسویں صدی کی پچاسویں دہائی میں۔ مجلۃ دعوۃ الحق (سہ ماہی)، ۱۹۶۵ء، دارالعلوم، دیوبند۔ صوت الامۃ (ماہانہ)، ۱۹۸۸ء، جامعہ سلفیہ، بنارس۔ مجلۃ الدعوۃ (پندرہ روزہ پھر ماہانہ)، ۱۹۷۵ء، جماعت اسلامی، نئی دہلی۔ جریدۃ الکفاح، ۱۹۷۳ء، جمعیۃ علماء ہند، نئی دہلی۔ مجلۃ الداعی (پندرہ روز پھر ماہانہ)، ۱۹۷۶ء، دارالعلوم، دیوبند۔ مجلۃ الثقافۃ (ماہانہ)، ۱۹۸۳ء، فضلائے دارالعلوم، دیوبند۔ مجلۃ المجمع العلمی الہندی (ششماہی)، ۱۹۷۶ء، مسلم یونیورسٹی۔ مجلۃ الرابطۃ الاسلامیۃ، ۱۹۸۶ء، فضلائے دارالعلوم، دیوبند۔ مجلۃ صوت السلام، ۱۹۸۸ء۔ جامعہ سبیل السلام، حیدرآباد۔ مجلۃ صوت الاسلام، ۱۹۸۹ء، غازی پور۔ مجلۃ الصحوۃ الاسلامیۃ (سہ ماہی)، ۱۹۸۹ء، دارالعلوم، حیدرآباد۔ مجلۃ النور (سہ ماہی)، ۱۹۸۹ء، اشاعت العلوم، اکل کوا۔ مجلۃ التاریخ الاسلامی، ۱۹۹۵ء، جمعیۃ التاریخ الاسلامی، نئی دہلی۔ مجلۃ آفاق الہند، ۱۹۹۲ء، وزارۃ خارجہ ہند، نئی دہلی۔ مجلۃ المظاہر (سہ ماہی)، ۱۹۹۵ء، مظاہرالعلوم، سہارنپور۔ مجلۃ النہضۃ الاسلامیۃ (سہ ماہی)، ۱۹۹۶ء، دارالعلوم، بستی۔ مجلۃ الحرم (قلیل مدت

کے لئے شائع ہوا)، جامعہ امدادیہ، مرادآباد۔ مجلۃ الاستقامۃ، ۲۰۰۵ء، جمعیت اہل حدیث، نئی دہلی۔ مجلۃ الفرقان (ماہانہ)، اکیسویں صدی کے اوائل، جامعہ ابن تیمیہ، بہار۔ مجلۃ الخیر (ماہانہ)، ۲۰۰۸ء، دار ارقم، نئی دہلی۔ مجلۃ العلیم (ماہانہ)، ۲۰۰۶ء، دار العلوم، جمدا شاہی، بستی۔ مجلۃ صوت الخریجین، جمعیت خریجی الجامعات السوریۃ فی الہند۔ مجلۃ الصلاح، الجامعہ الندویۃ، کیرالا۔ صحیفۃ رسالۃ الشباب (ماہانہ)، ۲۰۰۳ء، جمعیۃ شباب الاسلام لکھنؤ۔ جریدۃ اقرأ تتحسن لفتك العربیۃ، ۲۰۰۶ء۔ النشرۃ (سہ ماہی)، ۲۰۰۶ء، جماعت اسلامی، نئی دہلی۔ مجلۃ الجامعۃ (سہ ماہی)، ۲۰۰۶ء، الجامعۃ الاسلامیۃ، شانتاپرم، کیرالا۔ مجلۃ التضامن، ۲۰۰۵ء، ازہر العلوم، کیرالا۔ مجلۃ الآداب العربیۃ، النادی العربی، شعبہ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی۔ صحیفۃ الحراء (۱۰/روزہ)، حیدرآباد۔ مجلۃ النادی العربی، ندوۃ العلماء (سالانہ) ۱۹۹۸ء، ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔ مجلۃ النادی العربی (سالانہ)، الجامعۃ الاسلامیہ مظفر پور، اعظم گڈھ۔ مجلۃ الثقافۃ (سالانہ)، ۲۰۰۸ء، تاج المساجد، بھوپال۔ مجلة أقلام واعدة، ۲۰۰۸ء، حیدرآباد۔ مجلۃ النہضۃ (دوماہی)، کو تاکل، کیرالا۔ مجلۃ الدراسات العربیۃ (سالانہ)، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر۔ مجلۃ الزہرہ، الجامعۃ الاسلامیۃ، بھٹکل۔ مجلۃ العرب (ہفت روزہ)، ۱۳۵۸ھ، ممبئی۔ مجلۃ الرابطۃ الاسلامیۃ، ۱۹۸۶ء، نئی دہلی۔ مجلۃ أخبار الہند، ۲۰۰۶ء، ممبئی۔ مجلۃ الہند، (مصر و ہند کے تعلقات پر خاص نمبر)۔ مجلۃ الباقیات، خاص نمبر، ۱۹۷۴ء۔ مجلۃ النشرۃ (چہار ماہی)، ۲۰۰۹ء، اسلامی فقہ اکیڈمی، نئی دہلی۔ مجلۃ الفلاح۔ مجلہ مشاعر الامہ، ۱۴۲۸ھ، مدینۃ العلوم، بردوان، بنگال۔ جریدۃ المعہد، ۲۰۱۰ء، ملت نگر، مالیگاؤں۔ مجلۃ البحوث والدراسات، کٹولی لکھنؤ۔ وحدۃ الامۃ (ششماہی)، ۲۰۱۴ء، دار العلوم (وقف) دیوبند۔

مولانا محمد واضح رشید ندوی: عربی آسمان صحافت کے مولانا محمد واضح رشید ندوی ایک درخشاں ستارے تھے۔ ان کی پیدائش ۱۹۳۳ء میں تکیہ رائے بریلی میں حسنی خانوادے میں ہوئی، ان کے والد ماجد سید محمد رشید حسنی، مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی کے خویش یعنی ڈاکٹر عبدالعلی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے بہنوئی تھے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت تکیہ شاہ علم اللہ رائے بریلی میں خاندان کے بزرگوں کی نگرانی میں حاصل کی۔ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے عالمیت، فضیلت اور تخصص فی الادب کی اسناد حاصل کرنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بھی تعلیم حاصل کی۔

۱۹۵۳ء میں آل انڈیا ریڈیو دہلی کی ملازمت اختیار کرلی۔ وہاں پر انہوں نے عربی ترجمہ

کے کام کے علاوہ نظامت اور مختلف علمی ادبی، سماجی اور سیاسی موضوعات پر مضامین ضرورت کے اعتبار سے تحریر فرمایا۔ دہلی کے علاوہ ملک کے دوسرے ریڈیو اسٹیشنوں سے بھی ان کی تحریریں نشر ہوئیں۔ وہ اس ادارے سے تقریباً ۲۱ سال تک وابستہ رہے اور اپنے ماموں مولانا ابوالحسن ندویؒ کے مشورے سے ۱۹۷۳ء میں سرکاری ملازمت کو خیرباد کہہ کر دارالعلوم ندوۃ العلماء کے شعبہ تدریس سے وابستہ ہوگئے۔ عربی زبان وادب اور انشاء کے استاد مقرر ہوئے اور تب سے زندگی کے آخری لمحوں تک اسی درسگاہ سے وابستہ رہے۔ ندوۃ العلماء میں کلیۃ اللغۃ العربیۃ وآدابھا کے ڈین اور "المعہد العالی للدعوۃ والفکر الاسلامی" کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے کام کیا اور مولانا عبداللہ عباس ندوی کی رحلت کے بعد ۲۰۰۶ء میں ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم مقرر ہوئے۔

تدریسی خدمات کے ساتھ ساتھ مولانا نے مختلف فکری وادبی موضوعات پر کئی گراں قدر کتابیں تصنیف فرمائی ہیں۔ جن کو علمی اور ادبی حلقوں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ انکی مشہور ترین تصانیف درج ذیل ہیں:

مصادر الادب العربی، تاریخ الادب العربی (العصر الجاھلی) المسحۃ الادبیۃ فی کتابات الشیخ ابی الحسن علی الحسنی الندوی، أدب الصحوۃ الإسلامیۃ، حرکۃ التعلیم الإسلامی فی الھند وتطور المنھج، أدب أھل القلوب، الشیخ أبو الحسن علی الندوی قائدا حکیما، الدعوۃ الإسلامیۃ ومناھجھا فی الھند، الأمام أحمد عرفان الشھید (الجزء الخامس من سلسلۃ رجال الفکر والدعوۃ فی الاسلام)، مختصر الشمائل النبویۃ ﷺ، من صناعۃ الموت إلی صناعۃ القرارات، إلی نظام عالمی جدید۔

صحافت: مولانا نے آل انڈیا ریڈیو میں ایک طویل مدت تک نظامت، ترجمہ اور بعض دوسرے کاموں کو انجام دیا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء سے شائع ہونے والے دونوں مجلّات "البعث الاسلامی" اور "الرائد" کی مجلس ادارت میں شامل تھے اور دونوں کے مستقل کالم نگار تھے۔ براں مزید "ثقافۃ الھند" میں ان کے مقالات شائع ہوئے، ۴۰ سال سے زیادہ عرصہ "الرائد" اور ۳۵ سال سے زیادہ عرصہ "البعث الاسلامی" کی ادارت سے وابستہ رہے جبکہ "الرائد" کے ایڈیٹر ان چیف بھی ہوئے اور تادم حیات رہے۔ "الرائد" میں ان کے "افتتاحیات" یعنی ایڈیٹوریلس کو نہ صرف ہندوستان بلکہ عالم عرب میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

البعث الاسلامی میں ''صور وأوضاع'': ''صور وأوضاع'' مجلۃ البعث الاسلامی کا ایک کالم ہے مولانا محمد حسنیؒ کے ذریعہ ۱۹۵۵ء میں ''المنتدی الأدبی'' کے نام سے ایک أدبی انجمن کا ندوۃ العلماء میں قیام عمل میں آیا اور انھوں نے ڈاکٹر سعید اعظمی اور ڈاکٹر محمد اجتباء ندوی کے تعاون سے اکتوبر ۱۹۵۵ء میں اسی انجمن سے ماہانہ مجلہ کی اشاعت شروع کی۔ جب کہ مارچ ۱۹۶۰ء سے براہِ راست دارالعلوم ندوۃ العلماء کی نگرانی میں شائع ہونے لگا جیسا کہ یہ مجلہ ندوۃ العلماء کا ترجمان سمجھا جاتا ہے۔

یہ مجلہ ایک دعوتی پیغام اور فکر اسلامی سے وابستگی کے ساتھ ساتھ ادبی مضامین پر بھی توجہ دیتا ہے۔ اس مجلہ کی کوشش ہوتی ہے کہ ہندوستان اور عرب دنیا کے درمیان نقطۂ اتصال کا کام کرے اور دعوت اسلامی کو دنیا کے ہر گوشے میں پہچائے اس کی مقبولیت اور کامیابی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اپنے پہلے شمارے سے لے کر اب تک مستقل شائع ہو رہا ہے۔ اس مجلہ میں ''صور و اوضاع'' مولانا واضح رشید ندوی کا خاص کالم تھا۔

مولانا اس کالم میں عالم اسلام کے سیاسی حالات اور ہندوستان کے سیاسی سماجی اور تعلیمی صورت حال پر ایک اسلامی صحافی کی حیثیت سے بے لاگ تبصرے کرتے تھے ان میں بعض ایسے مضامین بھی ہوتے جن میں ہندوستان کے سیاسی پس منظر میں اردو اور انگریزی میں شائع شدہ مضامین کے حوالے بھی ہوتے جو عالم عرب کے دینی طبقے کے لیے دلچسپی کا باعث ہوتے۔

مولانا کبھی دوہری پالیسی پر تنقید کرتے ہیں، کبھی اقوام متحدہ کو مسائل کو سلجھانے اور دنیا میں قیام امن کے لئے اس کی ذمہ داریوں کا اسے احساس دلاتے تو کبھی عالم اسلام اور مغرب کے اسلام کے خلاف سازش اور ریشہ دوانیوں پر مفکرانہ اور دانشورانہ نظر ڈالتے۔ اس کالم کے تحت مولانا نے اسلام کو ایک مکمل اور جامع نظام حیات بتایا ہے جو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو محیط ہے یہ ولادت سے لے کر زندگی کی آخری سانس تک انسانی ضروریات اور معاشرتی تقاضوں کو پورا ہی نہیں کرتا بلکہ اس کے لئے صحیح اور واضح رہنمائی بھی پیش کرتا ہے۔ ان کے خیال میں اسلام ایک زندہ اور تندرست انسانی جسم کے مانند ہے جس کی تمام مؤثر کارکردگیاں اور صلاحتیں اسی وقت ظاہر ہوں گی جب اس کے تمام شعبوں کا لحاظ رکھتے ہوئے دین کا کام کیا جائے اور یہیں پوری امت مسلمہ کے لئے دعوت دین کی ذمہ داری ہے۔

اس کالم کے تحت وہ اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

إن الإسلام نظام متكامل للحياة، يشمل جوانب الحياة الفردية والاجتماعية

والروحية والمادية بدون تفريق وتمييز بينها ولا يقوم كيان الحياة الإسلامية ولا يتحقق له النصر والغلبة إلا إذا وجد ارتباط وتركيب متناسب بين سائر هذه العناصر التي يتكون منها الصرح الإسلامي وان مثله مثل البنيان الذي لا يقوم بمجرد مواد البناء والتشييد مهما كانت متينة ونافعة ووافرة.اذا لم تركب هذه الموادالمتفرقة بتنسيق متوازن وبتخطيط بنائي،لا يثبت هذا البناء في مكانه،ولا يؤدي وظيفته المنشودة إذا حدث خلل في التركيب...........(٦)

مولانا نے اپنے ایک دوسرے مقالے میں تخریب کاری کے رجحانات اور فاسد خیالات کے اصلاح پر زور دیا جس میں داعین اور مصلحین کو اس جانب توجہ دلائی ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا اور اسلامی بنیادوں پر معاشرے کی تعمیر کی اہمیت سے روشناس کرایا وہ لکھتے ہیں:

إن بناء المجتمع على أسس إسلامية أهم وأثمن من أي عمل للنهوض بالأمة الإسلامية ،فإنه أساس لأي مجهود ومنطلق له،وبدون إصلاح المجتمع على الأسس الإسلامية لا يثمر أي جهود ولاتأتي التضحيات مهما تضخمت نتائج مرتقبة(٧)	امت اسلامیہ کو بلندیوں تک پہنچانے کے لئے کسی بھی عمل سے زیادہ اہم اور قیمتی معاشرے کی اسلامی بنیادوں پر تعمیر ہے کیوں کہ کسی بھی کوشش اور اس کی شروعات کے لئے یہ بنیادی عنصر ہے اور اسلامی بنیادوں کے بغیر معاشرے کی اصلاح کی کوئی کوشش ثمر ور نہیں ہوگی اور نہ ہی بڑی سے بڑی قربانیوں سے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوں گے۔

اسی طرح انہوں نے اپنے بعض مقالات میں یورپی ممالک اور امریکا کے دہرے معیار پر تنقید کیا ہے اور اقوام متحدہ کے زیر نگرانی چلنے والے حقوق انسان کے ادارے کو برما میں حقوق انسانی کی پامالی سے آگاہ کراتے ہوئے اسے اس کے حل کے لئے اپنا رول ادا کرنے پر زور دیا وہیں ان مسلم ممالک کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا جو مغربی تہذیب پر تنقید پر پابندی لگاتے ہیں اور ایسی تنظیموں پر پابندی لگاتے ہیں جو اسلام کی روشنی میں اصلاح اور خیر کا کام کرتی ہیں۔وہ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> ”آزادی رائے کے اظہار کی اصطلاح جس کے لئے اس زمانے میں استعمال کی جاتی ہے اس کے کیا معنی ہیں؟اس کا ایک خاص مفہوم ان ملکوں میں ہے جو اس بات کے مدعی ہیں کہ اظہار رائے کی آزادی مغربی تہذیب کی علامتوں میں سے ایک ہے جیسا کہ

ہالینڈ کے وزیر خارجہ سٹیف بلوک نے دعوی کیا کہ اس حق کا چھیننا ممکن نہیں ہے۔لیکن یہ حق اسلام سے منسوب ملکوں میں سلب کیا گیا ہے، سیاسی اور زندگی کے بعض دوسرے شعبوں میں یورپی ممالک کی پیروی کے باوجود ان ملکوں کے لئے اظہار رائے کی آزادی کا معیار ان کے معیار سے مختلف ہے جنھوں نے اس اصطلاح کو وضع کیا ہے۔

اس متضاد اور اسلام اور مسلمانوں سے عدم تعاون نے مسلمانوں کی ہیبت کو غیر مسلمین کے دل سے نکال دیا، نتیجۃً اسلامی ممالک کا خوف باقی نہ رہا اگرچہ ان کی تعداد ۷۰ ہے"۔(۸)

الرائد: یہ ۱۵ روزہ جریدہ دار العلوم ندوۃ العلماء سے جولائی ۱۹۵۹ء سے شائع ہونا شروع ہوا۔ دراصل "الرائد" کے ذریعے ذمہ داران دار العلوم اپنے طلباء کے اندر عربی زبان میں کما حقہ تعبیر پر قدرت اور ثقافتی خبروں سے عرب ملکوں کو واقف کراتے ہیں وہیں یہ جریدہ گراں قدر اسلامی ادبی اور علمی مضامین شائع کرتا ہے اس کے پہلے ایڈیٹران چیف سید محمد رابع حسنی ندوی نے پہلے شمارے میں اس کے ہدف پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا کہ اس کا مقصد ایک صالح اسلامی معاشرے کی تعمیر کرنا ہے اور یہ جریدہ عرب دنیا کے ماہر قلم کاروں اور طلباء کے مقالوں کا مجموعہ ہے(۹) یہ جریدۃ تب سے برابر شائع ہورہا ہے اور مولانا واضح رشید ندویؒ تقریباً ۴۰ سال اس کی مجلس ادارت سے وابستہ رہے اور بعد میں ایڈیٹران چیف بھی منتخب ہوئے۔

مولانا اس میں "الافتتاحیۃ" یعنی ایڈیٹوریل کے تحت مختلف موضوعات پر اپنے مضامین تحریر فرماتے تھے۔ان میں اسلامی دعوت کا طریقہ کار، اسلامی عبادات وحدت اسلامی، اسلامی تاریخ یعنی اسلامی وعرب ممالک کے حالات، مسلمانوں کے مسائل اور انکے خلاف سازشیں، اسلام دین فطرت مسلم رہنماؤں کی ذمہ داریاں، مغربی تہذیب کے نقصانات اور استعماریت کے خطرات جیسے عناوین پر انہوں نے قابل قدر فکری سرمایہ چھوڑا ہے انہوں نے اپنے ان مضامین میں اسلامی کازکو پیش کیا اور مغربی دسیسہ کاریوں سے پردہ اٹھایا۔اسلام اور مسلمانوں کے خلاف عالمی سازشوں کا پردہ فاش کیا۔وہ فکر اسلامی کے نقیب اور علم بردار تھے وہ اپنی نگاہ بصیرت سے اسلام دشمن طاقتوں کی سازشوں کو بھانپ لیتے تھے پورے اخلاص اور شجاعت وجرأت سے صہیونی اور استعماری نظر وفکر پر ضرب لگاتے اور مسلم قائدین کو موجودہ مسائل کے حل کے لئے ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلاتے تھے۔

مولانا نے اپنے ایک ایڈیٹوریل "الاسلام دین الفطرۃ" کے عنوان سے تحریر فرمایا اور

بتایا کہ عقائد سے لے کر عبادات تک اسلام انسانی فطرت کے عین مطابق ہے اور اسی مطابقت کی وجہ سے اس کے اندر کشش ہے:

ولكون الإسلام دين الفطرة ودين الوسيطة والاعتدال يحمل جاذبية ، لكون تعاليم الإسلام مطابقة لطبيعة الإنسان يسهل العمل بها بدون أي نقص في شئون الحياة، ويمكن أن يشاهد ذلك في سائر مجالات العمل بالدين من العقيدة والصلوة والزكاة والحج.(۱۰)

اسلام دین فطرت اور دین اعتدال ہونے کی وجہ سے اپنے اندر کشش رکھتا ہے انسانی طبیعت سے اسلامی تعلیمات کے میل کھانے کی وجہ سے زندگی کے معاملات میں بغیر کسی نقص ومشقت کے اس پر عمل آسان ہوتا ہے۔عقیدہ،نماز، زکوۃ،اور حج جیسے دین کے جملہ عملی شعبوں میں اس کا مشاہدہ ممکن ہے۔

ایک دوسرے ایڈیٹویل میں حالات حاضرہ اور مسلمانوں کے احوال پر تحریر فرماتے ہیں:

إن هذا الوضع المأساوي الذي يعيشه المسلمون نتيجة مباشرة لتفرق كلمتهم وتوزعهم على معسكرات، وانتماءاتهم إلى أفكار ونظريات متصارعة والبحث عن حلول القضايا في منابر من يتربص بهم الدوائر ويكيد لهم المكايد ولا عزة ولا قوة للمسلمين سواء كانوا عربا أو عجما إلا بالإسلام وبالاعتصام بحبل الله المتين (۱۱)

یہ دردناک مصیبت جس سے مسلمان گزر رہے ہیں ان کے آپسی اختلافات،مختلف خیموں میں بٹ جانے، باہم مخالف نظریات وافکار سے جوڑنے ، ہر مسائل کے حل کی تلاش ان کے ممبروں سے کرنا ہے جو مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لئے گھات میں بیٹھے ہیں اوران کے خلاف سازشیں رچ رہے ہیں،مسلمان خواہ عرب ہو یا عجم انہیں اسلام اور اللہ کی اس رسی کو پکڑنے میں ہی قوت وطاقت اور عزت ہے۔

ایک دوسرے ایڈیٹوریل میں حکمت ودانائی کے ساتھ مواعظ حسنہ کے ذریعہ اسلامی دعوت پر زور دیا ہے اور اس طریقہ دعوت کوانھوں نے مادی تحریکات کی جانب سے برابر دشمنی پر مبنی سیاست کے باوجود دشمنی کا جواب دشمنی سے دینے کو منع فرمایا جیسا کہ وہ تحریر فرماتے ہیں:

”بلا شبہ مسلمان اور خاص طور سے ان کے متحرک افراد اور ان کے دینی تعلیم سے وابستہ لوگ نئی نئی پریشانیوں کا ہر جگہ سامنا کرر ہے ہیں لیکن اس طرح کے حالات میں ردعمل یا دشمنی کے جواب میں دشمنی کے بجائے اسلام،حق اور سچائی کی طرف لوگوں کو بلانا چاہیے اور

اسلام کی عمدہ تعلیمات حکمت ودانائی کے ساتھ علمی انداز میں پیش کرنا چاہیے‘‘۔(۱۲)

اپنے ایک ایڈیٹوریل میں اسلامی ملکوں کے حالات پر گفتگو کرتے ہوئے انہیں استعماریت کی یاددلاتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اس طرح کے حالات سے استعماریت کی واپسی کا خطرہ ظاہر ہوتا ہے اور پھر آگے تحریر فرماتے ہیں:

وإذا نجحت الدول الاستعمارية في خطتها لغزو العالم الإسلامي لن ينتهي هذا الاستعمار من الدول الإسلامية بل تمتد إلى دول العالم الأخرى بإحداث مبررات للتدخل، منها إحداث اضطرابات وقلاقل في صفوف الشعب والاضطراب في وضع الأمن والسلام وإحداث حروب بين الدول وإحداث فتنة بين مختلف المجموعات بدأ الاستعمار في أوساط القرن السابع من مصر ثم امتد إلى دول آسيا (۱۳)

جب استعماریت پسند ممالک اسلامی دنیا پر قبضے کے اپنے پروگرام میں کامیاب ہوجائیں گے تو یہ استعماری طاقتیں صرف اسلامی دنیا تک ہی محدود نہیں رہیں گیں بلکہ دنیا کے دوسرے ممالک تک اپنا دائرہ بڑھالیں گی اور اس مقصد کے حصول کے لئے کبھی عوام الناس میں بے چینی پیدا کرکے کبھی بدامنی کا بہانہ ڈھونڈ کر اور کبھی باہم ملکوں میں جنگ تھوپ کر تو کبھی مختلف گروہوں میں فتنہ پیدا کرکے دخل اندازی کا جواز فراہم کرلیں گی۔

اسلوب: مولانا کو زبان وادب سے بڑی مناسبت تھی۔زندگی کا طویل عرصہ عربی اور عالم عرب کو پڑھنے میں کچھ اس طرح گزرا کہ مترادفات کا بھرپور سرمایہ ان کے دل ودماغ میں بس گیا اور جدید عربی مطالعے نے ان کے اندر مزید ہمہ گریت پیدا کردی وہ عربی زبان وادب کے مزاج شناس اور نوک و پلک سے واقف ہوگئے۔وہ لفظوں کی نزاکت اور رموز وکنایات سے بخوبی واقف تھے فن کی لطافت اور اسلوب کی ندرت کو خوب پہچانتے تھے اور یہ ساری چیزیں ان کے اسلوب نگارش میں اپنی سحرانگیزی، شگفتگی، شیرینی، دل آویزی ،سلاست، فصاحت وبلاغت اور دیگر ادبی اور انشائی خصوصیات کے ساتھ موجزن تھیں۔اس کے ساتھ ان کی زبان آسان اور عام فہم ہوتی ہے۔آپ کی تحریروں میں ایمانی عنصر غالب تھا۔اپنی نگارشات کی روشنی میں وہ ایک ناقد بصیر، داعی حنون اور ناصح امین نظر آتے ہیں۔ان کو متعدد اعزازات سے نوازا گیا۔ان کی عربی اور صحافتی خدمات کے اعتراف میں جیسا کہ صدر جمہوریہ ہند کے خصوصی ایواڈ سے بھی سرفراز کیا گیا۔

بلاشبہ یہ اعلان اہل علم کے لئے باعث مسرت ہے کہ دارالرشید لکھنؤ البعث الاسلامی اور

الرائد میں مولانا کے چھپے ہوئے مقالات کو مجموعہ کی شکل میں جلد ہی شائع کرنے جارہا ہے۔

۹ جمادی الاولی ۱۴۴۰ھ مطابق ۱۶ جنوری ۲۰۱۹ء کی صبح ابھی آفتاب نے اپنی کرنیں نہیں بکھیری تھی کہ فکر اسلامی کے نقیب، ماہر انشاء پرداز، باخبر صحافی، بلند پایہ مصنف معتبر اور ایک کامیاب مدرس ادیب مولانا واضح رشید ندوی کو ایک نورانی چادر نے اپنی آغوش رحمت میں لے لیا اور روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را۔

مراجع

(۱)القرآن الكريم۔(۲)مروة، أديب، الصحافة العربية، نشأتها وتطورها، بيروت: مكتبة الحياة، ۱۹۶۱م۔ (۳) ندوی، محسن عثمانی، مصر کی عربی صحافت، دھلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ط/۱، ۱۹۸۹ء (۴)البلجرامي، غلام علي آزاد، سبحة المرجان في آثار هندستان،علي جره، معهد الدراسات الإسلامية جامعة علي جره الإسلامية، ج/۱۔(۵)الأعظمي، سعيد، الصحافة العربية نشأتها وتطورها،لكناؤ:مؤسسة الصحافة والنشر، ط/۱، ۲۰۰۹م۔(۶) الندوي، محمد واضح رشيد، الإسلام نظام كامل متكامل للحياة، مجلة البعث الإسلامي، لكناؤ:مؤسسة الصحافة والنشر المجلد:۶۴، العدد :۸، ربيع الأول ۱۴۴۰ھ/كانون الأول (دسمبر) ۲۰۱۸م۔(۷) الندوي، محمد واضح رشيد، مسئولية الدعاة والمصلحين لإصلاح الأوضاع الفاسدة والاتجاهات الهدامة، مجلة البعث الإسلامي، لكناؤ: مؤسسة الصحافة والنشر، المجلد: ۶۴، العدد :۱۰، جمادى الأولى ۱۴۴۰ھ/ شباط (فبراير) ۲۰۱۹م۔(۸) الندوي، محمد واضح رشيد، موقفان متناقضان لحرية الرأي، مجلة البعث الإسلامي، لكناؤ :مؤسسة الصحافة والنشر، المجلد: ۶۴، العدد: ۶، محرم، ۱۴۴۰ھ/تشرين الثاني (أكتوبر۔نوفمبر) ۲۰۱۸۔(۹)الأعظمي، سعيد، الصحافة العربية ؛ نشأتها وتطورها، لكناؤ: مؤسسة الصحافة والنشر، ۲۰۰۹م۔ (۱۰)الندوي، محمد واضح رشيد، الاسلام دين الفطرة، الرائد، لكناؤ: مؤسسة الصحافة والنشر، السنة: ۶۰، العددان ۸/ ذو القعدة و۴ ذو الحجة، ۱۴۳۰ھ/۱۔۱۶، آب (أغسطس) ۲۰۱۸م۔(۱۱)الندوي، محمد واضح رشيد، الوحدة الإسلامية الحل الوحيد للأزمات المعاصرة، الرائد، لكناؤ: مؤسسة الصحافة والنشر السنة: ۵۵، العدان: ۵۔۶، ۲ ۴ شوال ۹ ذو القعدة ۱۴۳۳ء/۱۔۶، أيلول (ستمبر) ۲۰۱۳م۔(۱۲) الندوي، محمد واضح رشيد، ادفع بالتي هي أحسن، الرائد، لكناؤ: مؤسسة الصحافة والنشر، السنة: ۵۱، العدد: ۲، ۲۲ رجب ۱۴۳۰ھ/ تموز (يوليو) ۲۰۰۹م۔(۱۳)الندوي، محمد واضح رشيد، الوضع في الدول الإسلامية يهدد بعودة عهد الاستعمار، الرائد، لكناؤ: مؤسسة الصحافة والنشر، السنة :۵۶، العدد: ۵، ذو الحجة ۱۴۳۵ء/ أيلول (ستمبر) ۲۰۱۴م۔

اخبار علمیہ

”بانس کا وطن اصلی“

مشہور زمانہ اخبار ”دی ہندو“ میں قدیم ترین ایشیائی بانس کے وطن اصلی کے متعلق یہ دلچسپ تحقیق شائع ہوئی ہے کہ اس کی پیدائش پہلے پہل ہندوستان میں ہوئی۔ رپورٹ کے مطابق سال ۲۰۱۸ء تک دریافت شدہ پودوں کی کل انچاس ہزار قسموں میں سے تقریباً گیارہ فیصد کی پیدائش ہندوستان میں ہوئی ہے، حال ہی میں زیر زمین قدیم حجری عہد کی اس دریافت نے ایشیائی بانس کی ابتدا کو بھی سرزمین ہند سے جوڑ دیا ہے۔ آسام میں کوئلہ کی ایک کان میں ملے ڈھائی کروڑ سال قبل کے اس نئی قسم کے بانس میں ایک کا نام Bambusiculmus Tirapemsis اور دوسرے کا نام B.Makumensis رکھا گیا ہے، لکھنؤ یونیورسٹی کے بیربل ساہنی انسٹی ٹیوٹ کے محقق گورو شری واستو کے مطابق یہ پانچ سے تیس ڈگری سیلسیس تک کے درجۂ حرارت میں پروان چڑھ سکتا ہے، اس کے اندر مختلف فضائی دباؤ کو برداشت کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے، ہندوستان میں رکازی نباتیات پر کم توجہ ہے لیکن مسلسل تحقیقات سے یہ حقیقت واہو رہی ہے کہ وطن عزیز اپنے اندر رکازی نباتیات کا ایک بڑا خزانہ رکھتا ہے۔

(بحوالہ اردو سائنس ماہنامہ، دہلی، نومبر ۲۰۱۹ء، ص ۲۴)

”آسٹریلیا کی ”رائٹ ٹو نو“ مہم“

رواں برس جون میں آسٹریلین فیڈرل پولیس کی جانب سے ”اے بی سی“ کے دفاتر اور نیوز کور خاتون صحافی انیکا سمیتھرسٹ کے مکان پر دبش دی گئی، اس کے بعد عوامی مفاد کی علم بردار صحافت کی بقا کے لیے ”رائٹ ٹو نو“ یعنی معلومات کا حق مہم شروع کی گئی۔ اس کے تحت آسٹریلیا کے تمام اخبارات نے اپنے صفحات سیاہ کردیے۔ اس مہم کا مقصد دراصل اس ”نیشنل سیکورٹی لا“ کے خلاف احتجاج بتایا گیا ہے جس میں آسٹریلیا میں رازداری کی فضا کو فروغ دینے اور صحافت کی آزادی کو محدود کرنے کی بات کہی گئی ہے۔ اس مہم میں ”نیوز کور، دی اے بی سی، نائن، ایس بی ایس، دی گارجین اور صحافتی تنظیم ”دی میڈیا“ اور ”انٹرٹینمنٹ اینڈ آرٹس“ شامل ہیں۔ رائٹر کی رپورٹ میں اس احتجاج کا دوسرا مقصد

حکومت پر دباؤ ڈالنا بھی بتایا گیا ہے تاکہ اس قانون سے صحافیوں کو مستثنیٰ قرار دیا جائے اور معلومات کی آزادی کے مناسب نظام کا نفاذ اور ہتک عزت کے مقدمات کے معیار کو بلند کیا جائے۔ واضح رہے کہ اس سے قبل لبنان کے معروف انگریزی اخبار ''ڈیلی اسٹار'' نے اپنے ۱۲ رصفحات بغیر خبر کے شائع کر کے اپنا منفرد احتجاج درج کرایا تھا۔ بہر حال آسٹریلیا کے محدود بازار میں ذرائع ابلاغ کی آزادی کے لیے ان اداروں کا متحد ہو جانا غیر معمولی قدم ہے۔ (سیاست حیدر آباد، ۲۲/ اکتوبر ۲۰۱۹ء، ص ۴)

''خالی پیٹ فیصلہ پر ایک نئی تحقیق''

عالمی سطح پر تیار کی گئی ایک رپورٹ کے مطابق اگر انسان بھوکا ہے تو اس کی قوت فیصلہ مستحکم نہیں ہوتی اور وہ کم منفعت بخش فیصلوں پر اکتفا کر لیتا ہے۔ اس نوعیت کے فیصلہ سے زندگی میں لیے جانے والے دوسرے فیصلے بھی متاثر ہوتے ہیں۔ یونیورسٹی آف ڈنڈی، برطانیہ سے وابستہ بنجامن ونسینٹ نے یہ رپورٹ تیار کی ہے۔ رپورٹ کے مطابق اس کے شرکا سے غذا، رقومات اور دیگر فوائد کے بارے میں سوالات کیے گئے اور پوچھا گیا کہ جب وہ بھوکے ہوں تو اس تعلق سے کیا فیصلے کریں گے تو ان کا جواب یہ تھا کہ بھوک کو فوری طور پر مٹانے کے لیے جو چیز بھی دستیاب ہوتی ہے لوگ اسی پر ہاتھ صاف کر لیتے ہیں۔ باورچی خانہ میں یہ منظر اکثر دیکھنے کو ملتا ہے کہ بھوک سے بیتاب شخص کو جو چیز بھی نظر آتی ہے اس کا ایک یا دو ٹکڑا اپنے منہ میں ڈال لیتا ہے، حالانکہ اس سے اس کی بھوک زائل نہیں ہوتی بلکہ اس کو جو بھی چیز تیار ملی اس نے چکھ لی اور اس غذا کی افادیت و عدمِ افادیت کے متعلق اس نے فیصلہ نہیں کیا۔ قابل غور بات یہ ہے کہ دنیا میں ایسے بہت سے بدنصیب ہیں جو مسلسل فاقہ کشی کا شکار ہیں تو ان کے فیصلے کس طرح متاثر ہوں گے۔ جب ایسے لوگوں کی فوری امداد کی جائے گی تو وہ کسی بہتر چیز کا مطالبہ کرنے یا اپنا حق مانگنے کے بجائے اسی چیز پر اکتفا کر لیں گے اور ان کا یہ فیصلہ ان کے آئندہ فیصلوں کو بھی بلاشبہ متاثر کرے گا۔ بھوک کے اسی موقف کا فائدہ اٹھا کر بڑی بڑی کمپنیاں ایسے فاقہ کش لوگوں کا استحصال کرتی ہیں۔ یہ تحقیقی رپورٹ مجلہ ''سائیکونومک بلیٹن اینڈ ریویو'' میں شائع کی گئی۔

(احمد ٹائمز، نومبر ۲۰۱۹ء، ص ۱۷)

''ماحول دوست اسپرے''

گذشتہ دنوں ایمیزون کے بارانی جنگلات میں بھڑکنے والی آگ نے ہر حساس شخص کو مغموم کر دیا ہے۔اب ایسے ہولناک حادثات سے بچنے کے لیے اسٹینفرڈ یونیورسٹی کے سائنسدانوں نے ایک حفاظتی جِل تیار کیا ہے جس کو چھڑک کر درختوں کو فائر پروف بنایا جاسکتا ہے۔آتش زدگی سے بچانے والے یہ اسپرے پودوں سے حاصل شدہ سیلولیوز پالیمرز اور سیلکا ذرات سے بنایا گیا ہے۔سیلکا اپنی ساخت میں ریت کے ذرات کی طرح ہے۔ان دونوں اشیا کو آگ بجھانے والے ایک مائع میں ڈبویا گیا ہے۔دنیا بھر میں آگ لگنے کے بعد آگ بجھانے کے انتظامات کیے جاتے ہیں لیکن اس فائر پروف اسپرے کو آگ لگنے سے پہلے ہی جنگلات پر چھڑکا جاسکتا ہے۔محققین کے بیان کے مطابق اس کے استعمال سے درخت، پودے اور سبزے جھلسنے سے نجات پاتے ہیں اور یہ اسپرے ہر طرح کے زہریلے اثرات سے پاک اور حیاتی طور پر از خود ختم ہونے والا ہے۔یہ ہوا اور بارش سے دھل کر غائب نہیں ہوتا۔کیلی فورنیا کے بعض درختوں اور تجربہ گاہ میں گھاسوں پر اس کی آزمائش کی جاچکی ہے،جس کے خوشگوار اور مثبت نتائج برآمد ہوئے ہیں۔برفباری، تیز ہوا اور نصف انچ بارش اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی،البتہ تیز وتند اور طوفانی بارش کے بعد یہ بہہ کر ضائع ہوسکتا ہے۔خوش آئند خبر یہ ہے کہ ایک اسپرے (یعنی ایک بار چھڑکاؤ) آتش زنی کا ایک مرحلہ سہنے اور پودوں کو بچانے کے لیے کافی ہے۔واضح رہے کہ پوری دنیا میں ہر سال لاکھوں ایکڑ جنگلات جھلس کر ختم ہورہے ہیں جس سے جنگلات کے ساتھ ماحولیات کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ رہا ہے۔اگر یہ جل کامیاب ہوجاتا ہے تو بڑے ماحولیاتی سانحے کو رونما ہونے سے روکا جاسکتا ہے۔(منصف حیدرآباد، ۸/اکتوبر ۲۰۱۹ء،ص ۱۰)

(ک۔ص۔اصلاحی)

☆☆☆

وفیات

آہ! پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی

(۱۹۲۴ء-۲۰۱۹ء)

۴؍نومبر کو یہ اندوہناک خبر ملی کہ جناب ریاض الرحمٰن خاں شروانی اس دنیا میں نہیں رہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ۱۹۲۴ء میں حیات لائی ۲۰۱۹ء میں قضا لے چلی، زندگی میں عمر کی برکت کے ساتھ دوسرے انعامات خداوندی کی کمی نہیں رہی، دانشور، معلم، مصنف، صحافی کی حیثیت سے ان کا جہاں آباد رہا، ان کے رخصت ہونے سے ایک دنیا ویران سی ہوگئی لیکن دارالمصنّفین کے لیے ان کا جانا کچھ اور ہی سانحہ ہے، وہ دارالمصنّفین کی مجلس انتظامیہ اور معارف کی مجلس ادارت کے رکن رکین ہی نہیں تھے دارالمصنّفین کی سو سال سے زیادہ کی زندگی میں قدیم ترین تعلقات اور ان رشتوں کے امین بھی تھے جن کی مثال شاذ و نادر ہی ملتی ہے، ان کے جد امجد حبیبِ شبلی مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی اور ان کے والد ماجد نواب عبید الرحمٰن خاں شروانی نے دارالمصنّفین کے بانی اور معماران سے جو قلبی و قلمی تعلقات استوار رکھے اور جن کی ایک مستقل تاریخ ہے، ہمارے ریاض الرحمٰن خاں اسی تاریخ کا شاندار تسلسل بن گئے، ان کے اب و جد واقعی صاحب ریاست تھے، نواب کا لقب ان کی شخصیتوں کا جز و لاینفک بنا لیکن واقعہ یہ ہے کہ نوابی اور ریاست ان کو علم کی حاصل رہی، کمال عزت اور جوہر شرافت کا ذکر کبھی مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کی داستان کا سرعنوان ہوتا، ۵۱ء میں ان کا انتقال ہوا تو حضرت سید سلیمان ندویؒ نے لکھا کہ وہ اپنے دور کے خاتم تھے، ۹۲ء میں نواب عبید الرحمٰن خاں شروانی نے وفات پائی تو مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحبؒ نے لکھا کہ افسوس اب وضع داری، شرافت، تہذیب اور شائستگی کا یہ نمونہ کبھی دیکھنے کو نہیں ملے گا، آہ! اب فرزند عبید و حبیب شبلی کی رحلت پر معارف کے لب پر یہی صدا ہے کہ ؎

قفا نبك من ذكرىٰ حبيب ومنزل

خدا جانے وہ کون سی ساعت تھی کہ عہد لودی میں شروانی خاندان کا تحفہ سرزمین ہند کو عطا ہوا، سپہ سالاری کا منصب ان کا منتظر تھا، بعد میں گو سپہ سالاری آتی جاتی رہی لیکن زندگی کی مختلف راہوں میں یہ افغانی خاندان اپنے لیے نئے کوہ و کمر تلاش کرتا رہا، سپاہی رئیس بنتے گئے، یہ اچھی بات تھی مگر

۵۳ء کے ریاض الرحمٰن شروانی کے لیے یہ انقلاب پسندیدہ اس لیے نہیں رہا کہ تہذیب و شائستگی اپنی جگہ درست لیکن جرأت و استقامت اور عالی حوصلگی و فراخ دلی جیسی مردانہ صفات جو آبا و اجداد کا سرمایۂ زیست تھیں، خاندان کے خاندان اس سے بتدریج محروم ہوتے گئے، قریب ۷۰ سال پہلے ان خیالات میں جوش اور رنگ زمانہ کی آمیزش ہوسکتی ہے لیکن جناب ریاض الرحمٰن خاں کی افتاد طبیعت کا یہ ایسا مظہر ہیں کہ ان کی ساری زندگی کو پرکھنے کے لیے اس سے بہتر زاویہ کوئی اور نہیں۔

خاندانی روایت کے مطابق ان کی تعلیم و تربیت دونوں قدیم و جدید کا بہترین مجموعہ کہی جاسکتی ہے، مسلم یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی، عربی زبان میں پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری لی، قاہرہ یونیورسٹی بھی گئے، تعلیم کے بعد تدریس میں بھی نمایاں کارکردگی رہی، خصوصاً کشمیر یونیورسٹی میں انہوں نے شعبۂ عربی کو بڑی ترقی دی، وہاں شعبۂ اسلامیات بھی قائم کیا، درس و تدریس کا یہ سلیقہ ان کو ایسے ماہر فن اساتذہ کی برکت سے آیا جن کو وہ کبھی بھول نہ پائے، سید مظہر علیم فرید آبادی، سید محمد ٹونکی، پروفیسر عبدالعزیز میمن اور مصر کے ڈاکٹر طٰہٰ حسین، محمد تیمور وغیرہ چند نام ہیں جن کا ذکر انہوں نے بارہا کیا۔

ان کی تدریسی خدمات کا باب ہی اتنا روشن ہے کہ ان کی داستانِ حیات، پڑھنے اور بڑھنے کا ہر گر سکھا دیتی ہے لیکن جس چیز نے ان کو فخر خانوادۂ شروانی بنایا وہ قرطاس و قلم سے ان کی گہری وابستگی اور اس سے بھی زیادہ حرمت قلم کی پاسداری ہے، حیرت ہوتی ہے کہ عمر کی ان منزلوں پر جہاں سانسیں بھی آہستگی کا تقاضا کرتی ہیں وہ فکر و دانش اور زندگی کی سچائیوں کا عرق کشید کرتے رہے، بےباک اور بےتکان، خصوصاً رسالہ کانفرنس گزٹ کی ادارت نے مسلم یونیورسٹی، تعلیم، ملکی سیاست، ادب اور مذہب جیسے موضوعات پر حیرت انگیز تحریروں کا خزانہ پیش کردیا، ان کے سوچنے کا انداز ہی کچھ اور تھا، جذباتیت، شعلہ مزاجی اور آتش نفسی جو عرصہ سے ہماری قومی تحریروں کا جزو غالب نظر آتی ہے اس کے برعکس وہ مستقل کہتے رہے کہ ہمارے درمیان ایسے ذی فہم، صائب الرائے، معتدل مزاج لوگ موجود ہوں جو معاملہ کی نزاکت کو خود بھی سمجھیں اور اپنے ہم مذہبوں کو بھی سمجھائیں، ان کی فکر کا حاصل یہی رہا کہ اعتدال و توازن کا مطلب نہ سپر اندازی ہے اور نہ خوشامد و تملق، تہذیب نفس کس کا نام ہے یہ جاننے کی ضرورت ہے، ان کے اداریے یا شذرات واقعی نسخہ ہائے کیمیا کی حیثیت رکھتے ہیں، پڑھنے والوں کو شدت سے ان کا انتظار رہتا اور اس سے بھی زیادہ انتظار کتابوں پر ان کے تبصروں کا بھی رہتا تھا،

موجودہ دور میں شاید ہی ان سے زیادہ تبصرہ نگاری کا حق کسی اور کے قلم نے ادا کیا ہو، وہ پوری کتاب پڑھتے اور اس سے بھی زیادہ وہ مصنف یا مولف کے ذہن و دماغ کو پڑھتے اور بڑے دلچسپ انداز میں وہ بات کہہ جاتے جس کو کہنے کے لیے دوسرے تبصرہ نگار، مصلحت، مبالغہ اور مفاد کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر رہ جاتے، وہ کچھ نہ لکھتے تو صرف یہ تبصرے ہی ان کی شہرت دوام، علوئے مقام اور نیکیٔ نام کے لیے کافی تھے، ان کی فطری اور جبلی جرأت و مروت قدم قدم پر تنقید و تقریظ کے گل کھلاتی رہتی، وہ تبصرہ اور تقریظ کے فرق نازک سے یوں واقف تھے کہ ان کی نظر میں تقریظ محض ثنا خوانی ہے اور تبصرہ، تجزیہ نگاری، وہ اس نکتہ سے آشنا تھے کہ کتاب کا متن جس طرف رہنمائی کرے، تبصرہ نگار اسے بے کم و کاست احاطۂ تحریر میں لے آئے۔

واقعیت اور حقیقت شناسی کی نعمت ہی ہے کہ جب انہوں نے اپنی داستان حیات کا ایک باب دھوپ چھاؤں کے نام سے تیار کیا تو یہ سوال ان کے سامنے تھا کہ وہ خود سب سے زیادہ کس شخصیت سے متاثر ہوئے؟ ان کے جاننے والوں کے نزدیک فوری جواب مولانا ابوالکلام آزاد، سرسید، شبلی یا خود ان کے خاندانی بزرگ ہو سکتے تھے، لیکن ان کا جواب تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے قلب سلیم اور دیدۂ بینا عطا کیا ہے تو سب سے زیادہ متاثر کرنے کے لائق تو تاریخ عالم میں بس ایک ہی شخصیت گزری ہے، حضرت احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، یہ نری عقیدت نہیں ہے تاریخی حقیقت بھی ہے، تاریخ عالم کوئی دوسری ایسی شخصیت پیش کرنے سے قاصر ہے جو دین و دنیا کی اس طرح جامع ہو، جیسے آپؐ تھے، اس کے بعد انہوں نے جس طرح ایک صفحہ میں اس اجمال کی تفصیل کی ہے اور بات جہاں ختم کی ہے کہ نبی اکرمؐ کسی ایک شخص کی میراث نہیں ہیں، ہر مسلمان بلکہ ہر دیدہ ور انسان آپ سے متاثر ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے، یہ الفاظ خاتمہ بالخیر کی بشارت نہیں تو اور کیا ہیں، یقین ہے کہ یہ الفاظ ان کو اعلیٰ علیین کا مستحق بنا دیں گے اور ان کے خانوادہ شروانی کی روایتوں کو اس دنیا میں بھی زندہ رکھنے کا سبب بن جائیں گے، ان کے صاحبزادے کے بارے میں زیادہ نہیں معلوم، لیکن انہوں نے اپنی ایک نہایت قابل قدر کتاب ''انسان کیسے کیسے'' کا انتساب اپنے پوتوں بلال اور ہشام کے نام کیا ہے اور وہ بھی اس دعا کے ساتھ کہ وہ انسانیت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوں، ہم بھی اس دعا پر آمین کہتے ہیں کہ یہ نیک نام خانوادہ ماضی کی عظمتوں کے سایہ میں مستقبل میں نئے چراغ روشن کرتا رہے۔ (ع۔ص)

رسید کتب موصولہ

انفارمیشن ٹکنالوجی سے مربوط مسائل واحکام: مفتی سید باقر ارشد، قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، حضرت نظام الدین، نئی دہلی۔ قیمت ۱۸۰/روپے

جنوب کے اصحاب کمال، جلد اول و دوم: ڈاکٹر راہی فدائی، الانصار پبلی کیشنز، ریاست نگر حیدر آباد۔ قیمت بالترتیب ۵۰۰/روپے، ۵۰۰/روپے

حیات مورخ اسلام (مولانا ڈاکٹر محمد عاصم اعظمی): جمع وترتیب: مولانا نعیم الاسلام قادری و مولانا محمد احسان شمسی، بیت الحکمت، کریم الدین پور، گھوسی، مئو۔ قیمت ۴۰۰/روپے

خطوط مشاہیر بنام حضرت مولانا محمد عمران خاں صاحب ندوی ازہری، مرتب: ڈاکٹر مسعود الرحمٰن خان ندوی، مولانا محمد عمران خاں ایجوکیشنل اینڈ سوشل ویلفیئر سوسائٹی، بھوپال۔ قیمت ۵۰۰/روپے

صفحات ادب: مفتی سید باقر ارشد، کرناٹک اردو اکیڈمی، بنگلور۔ قیمت ۲۵۰/روپے

فتاویٰ دار العلوم مئو: جلد اول، ترتیب وتخریج مفتی ریحان مبشر قاسمی، مدرسہ دار العلوم مئوناتھ بھنجن (یو،پی) قیمت درج نہیں۔

گیسوئے افکار: ڈاکٹر امام اعظم، بک امپوریم اردو بازار سبزی باغ، پٹنہ۔ قیمت ۳۰۰/روپے

معدن الفضائل فی شرح شمائل: شیخ محمد فاضل شہید بن محمد حامد، تحقیق وتعلیق: مولانا محمود علی مصباحی، المجمع الاسلامی، ملت نگر، مبارکپور، اعظم گڑھ۔ قیمت درج نہیں۔

مکاتیب مفکر اسلام بنام سعید الرحمٰن الاعظمی: مرتب مولانا محمد سعید الرحمٰن الاعظمی، مکتبۃ الشباب العلمیہ لکھنؤ، شباب مارکیٹ، ندوہ روڈ لکھنؤ۔ قیمت ۱۸۰/روپے

نذیر فتح پوری نئے گیتوں کا ساحر: مرتب ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، مکتبہ کوہسار، ۳۔ بھیکن پورہ، بھاگل پور، بہار۔ قیمت ۱۵۰/روپے

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

کتاب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-
سیرۃ النبیؐ	
(خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2200/-
علامہ شبلی و سید سلیمان ندوی	
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-
الفاروق	300/-
الغزالی	200/-
المامون	175/-
سیرۃ النعمان	300/-
سوانح مولانا روم	220/-
شعر العجم اول	300/-
شعر العجم دوم	150/-
شعر العجم سوم	125/-
شعر العجم چہارم	200/-
شعر العجم پنجم	150/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی	350/-
(محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	
الکلام	250/-
علم الکلام	200/-

کتاب	قیمت
موازنہ انیس و دبیر	250/-
اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر	100/-
سفرنامہ روم و مصر و شام	200/-
کلیات شبلی (اردو)	220/-
کلیات شبلی (فارسی)	45/-
مقالات شبلی اول (مذہبی)	170/-
مرتبہ: سید سلیمان ندوی	
مقالات شبلی دوم (ادبی) 〃	70/-
مقالات شبلی سوم (تعلیمی) 〃	80/-
مقالات شبلی چہارم (تنقیدی) 〃	200/-
مقالات شبلی پنجم (سوانحی) 〃	150/-
مقالات شبلی ششم (تاریخی) 〃	90/-
مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ) 〃	100/-
مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری) 〃	110/-
خطبات شبلی مرتبہ: عبدالسلام ندوی	80/-
انتخابات شبلی مرتبہ: سید سلیمان ندوی	45/-
مکاتیب شبلی اول 〃	150/-
مکاتیب شبلی دوم 〃	190/-
اسلام اور مستشرقین چہارم (علامہ شبلی کے مقالات)	250/-

ISSN 0974 - 7346 Ma'arif (Urdu) -Print
December 2019 Vol - 204 (6)
RNI. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP-43/019
Monthly Journal of
Darul Musannefin Shibli Academy
P.O.Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P. (India)

مطبوعات شبلی صدی

۱۔	سیرۃ النبیؐ جلد اول ودوم (یادگار ایڈیشن)	علامہ شبلی نعمانی	2000/-
۲۔	شبلی کی آپ بیتی	ڈاکٹر خالد ندیم	325/-
۳۔	دارالمصنّفین کے سو سال	کلیم صفات اصلاحی	350/-
۴۔	شذرات شبلی (الندوہ کے شذرات)	مرتبہ: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	220/-
۵۔	محمد شبلی لائف اینڈ کنٹری بیوشنس	ڈاکٹر جاوید علی خاں	230/-
۶۔	حیات شبلی	علامہ سید سلیمان ندوی	650/-
۷۔	مولانا الطاف حسین حالی کی یاد میں	اشتیاق احمد ظلی	250/-
۸۔	حیات سعدی	تصنیف: خواجہ الطاف حسین حالی	400/-
۹۔	شبلی شناسی کے اولین نقوش	مرتبہ: ظفر احمد صدیقی	600/-
۱۰۔	شبلی ایک دبستان	آفتاب احمد صدیقی	250/-
۱۱۔	متاع رفتگاں	شاہ معین الدین احمد ندوی	200/-
۱۲۔	یہود اور قرآن مجید	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	150/-
۱۳۔	رسائل شبلی	علامہ شبلی نعمانی	300/-
۱۴۔	اردو ترجمہ مکاتیب شبلی	ڈاکٹر خالد ندیم	110/-
۱۵۔	تاریخ بدء الاسلام (علامہ شبلی نعمانی)	مرتبہ: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	300/-
۱۶۔	مراسلات شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	150/-
۱۷۔	مطالعات شبلی	مرتبہ: اشتیاق احمد ظلی	550/-
۱۸۔	الفاروق (ہندی)	علامہ شبلی نعمانی	450/-
۱۹۔	الندوہ (جلد ۱۔۹)		4735/-